برِّصغیر میں

اہلِ حدیث کی اوّلیات

مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ

جمعية المناهل الخيرية
گوجرانوالہ

برِّصغیر میں

اہلِ حدیث کی اوّلیات

مولانا محمد اسحاق بھٹی

دارابی الطیب
للنشر والتوزیع

برِصغیر میں

اہلِ حدیث کی اوّلیات

مولانا محمد اسحاق بھٹی

کمپوزر: .... محمد لقمان سعید

طبع اول: .... ستمبر 2012ء

تعداد: 1100

قیمت ....

ناشر

دار أبي الطيب للنشر والتوزيع

گلی نمبر 5، حمید کالونی، گل روڈ، گوجرانوالہ

Tel:0092-55-3735977 / 0321-6466422
Fax: 0092-55-3733934
Emial: dar_abitayyab@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
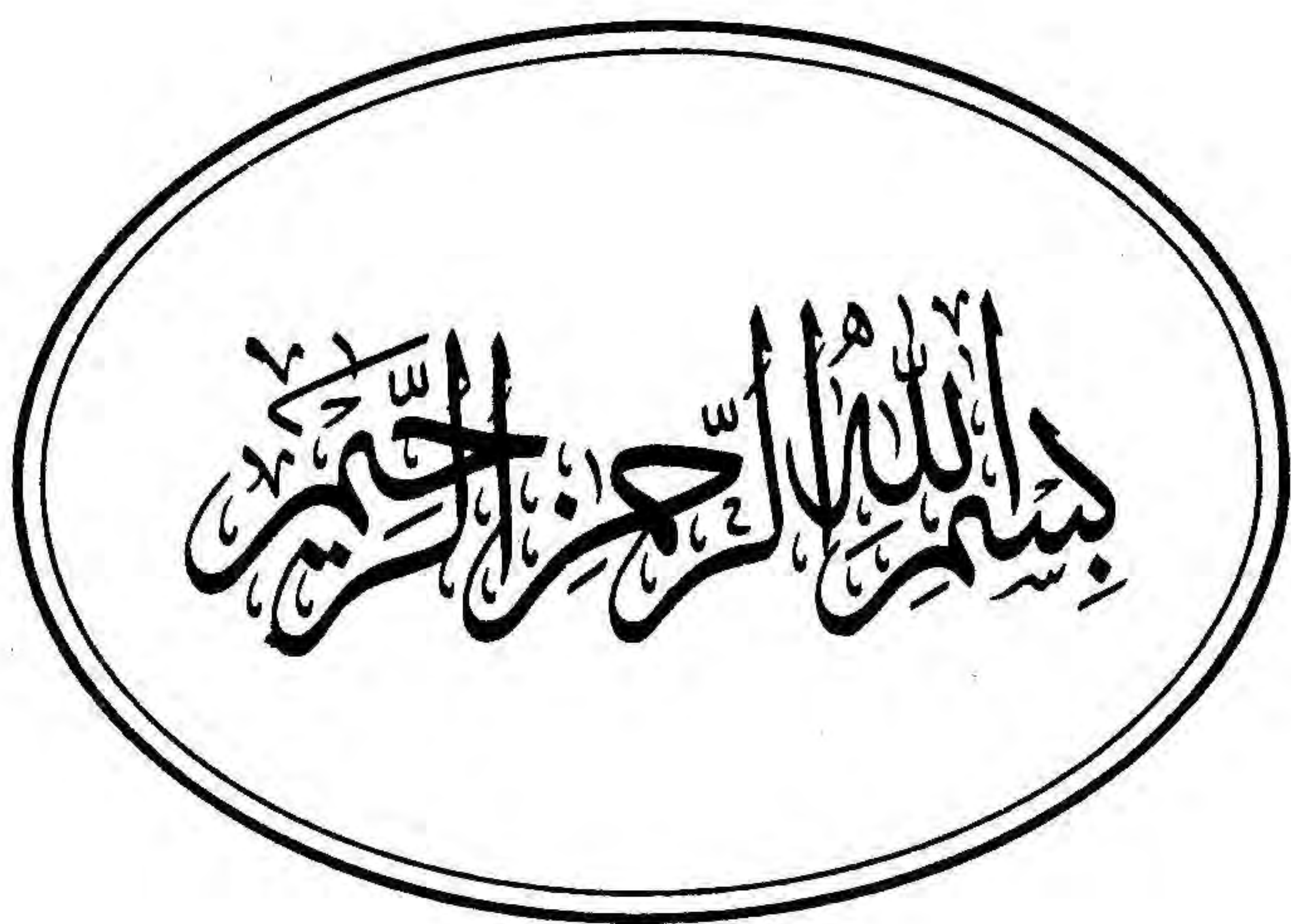
انتساب

مجھے نہیں معلوم میری یہ حقیر سی قلمی کاوش میرے عزیز دوستوں مولانا عارف جاوید محمدی اور مولانا صلاح الدین مقبول احمد کی توقع کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس موضوع سے متعلق میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا تھا، مختصر الفاظ میں عرض کر دیا۔ اس کا انتساب انہی دوستوں کی طرف کرتا ہوں اور دعاؤں کا طالب ہوں۔

محمد اسحاق بھٹی

فہرست

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

❁❁❁❁❁

کتاب اور مصنفِ کتاب میری نظر میں

شیخ صلاح الدین مقبول احمد

اوّلیت، اقدام اور پیش قدمی کی سعادت اپنے ماحول میں ان قدآور اور کوہ وقار شخصیتوں کے حصے میں آتی ہے جو عزم واستقلال، علم وفضل، نظم وضبط اور اپنے مشن سے والہانہ وابستگی کے سبب دوسروں سے ممتاز ہوتی ہیں۔

کارِخیر میں اوّلیت کے چشمے دل کی گہرائیوں میں پھوٹتے ہیں جو اپنے ماحول کی سیرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ تکلف وتصنع کا اس عمل میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اوّلیات اور اوائل کی اہمیت

اوّلیات اور اوائل کی اہمیت بطورِ خاص کارِ خیر میں مسلم ہے۔

- قرآن کریم میں ﴿اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ...﴾ (التوبة: 100) کا تذکرہ اجروثواب کے اعتبار سے استثنائی اہمیت کا حامل ہے۔
- سورۃ الحدید (آیت: 10) میں سب کو جنت کی خوش خبری کے باوجود فتح مکہ سے قبل اور بعد میں انفاق اور جہاد فی سبیل اللہ کے درجے اور ثواب میں فرق بتایا گیا ہے۔
- آیتِ کریمہ ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (آل عمران: 96) میں وارد ''اول بیت'' (بیت اللہ الحرام) کی فضیلت واہمیت کس پر پوشیدہ ہے؟

اسی طرح حدیث میں وارد اوّلیات کا احاطہ بعض ائمۂ محدثین نے اپنی مستقل تصانیف میں اور بعضوں نے اپنی کتابوں کے ابواب میں ضمناً کیا ہے۔

اوّلیات شریعت کی نظر میں

اوّلیات کے سلسلے میں شریعت کا مبنی برانصاف ضابطہ ملاحظہ فرمائیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ جریر بن عبداللہ البجلی اور ابو جحیفہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے اسلام میں کسی کارِ خیر کی ابتدا کی، اسے اس کا اور اجر میں کوئی کمی آئے بغیر اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اجر ملے گا، اور جس نے اسلام میں کسی کارِ بدکو رواج دیا، اس پر اس کا گناہ اور اس کے بعد کوئی کمی آئے بغیر اسے انجام دینے والوں کا گناہ ہوگا۔''[1]

عدل وانصاف پر مبنی اسی اصول کے تحت حدیت میں وارد ہے:

''کسی انسان کو جب بھی قتل کیا جائے گا، تو اس کے گناہ کا ایک حصہ آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے ''قابیل'' پر ہوگا، کیوں کہ اس نے سب سے پہلے قتل کو رواج دیا۔''[2]

کتاب وسنت میں وارد نصوص سے ''کارِ خیر'' اور ''کارِ بد'' میں اوّلیت اور پیش قدمی کی جزا اور سزا کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

تدوینِ اوّلیات سے متعلق علمائے کرام کی کاوشیں

ہمارے علمی، ثقافتی اور تاریخی خزانے میں وہ ہیرے اور جواہرات موجود ہیں، جن کا دوسری قوموں کے خزانے میں وجود نہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (1017) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (107)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (3157) صحيح مسلم، رقم الحديث (1677)

اسلاف کو بحرِ علم وفن میں غوّاصی سے کتنا شغف تھا؟ دنیا کی لائبریریاں شاہد ہیں کہ سیف وسنان سے وابستگی کے ساتھ ان کے قلم کی اَنی بھی ہمیشہ بے نیام رہا کرتی تھی۔

تصنیف وتالیف میں تنوّع سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے علم کے ہر باب پر دستک دی، تاریخ وجغرافیہ میں بھی درجۂ کمال کو پہنچے۔ بحث وتحقیق کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جس پر ان کی تصنیفات موجود نہ ہوں۔

اوّلیات کا موضوع دراصل تاریخ وجغرافیہ سے متعلق ہے کہ فلاں نے فلاں کام فلاں جگہ سب سے پہلے انجام دیا۔

اوّلیات کے مصنفین میں کسی نے حدیث واثر میں وارد اوّلیات کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا، کسی نے عام معلومات اور جنرل نالج کے طور پر مختلف میدانہائے عمل کی اوّلیات کو جمع کیا اور کسی نے مخصوص علاقے میں مخصوص حضرات کی اوّلیات کو یک جا کیا۔ اپنے ناقص علم کے مطابق اس موضوع پر عرب مصنفین اور ان کی عربی کتب کی فہرست درج ذیل ہے:

- سعید بن ابی عروبہ (157ھ)
- ہشام الکلبی (204ھ)
- المدائنی (225ھ)
- ابن ابی شیبہ (235ھ) نے اپنی کتاب ''مصنف'' میں حدیث کی (315) اوّلیات کا ذکر فرمایا۔
- ابو محمد بن قتیبہ الدینوری (276ھ) نے اپنی کتاب ''المعارف'' میں اوّلیات کا تذکرہ کیا۔
- ابن ابی عاصم الشیبانی (287ھ) ''الاوائل'' ان کی مستقل تصنیف ہے۔
- ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (360ھ) ان کی مستقل کتاب ''الاوائل''

میں حدیث میں وارد (88) اوّلیات کا تذکرہ ہے۔

- ابو ہلال العسکری (بعد 395ھ) ''الاوائل'' ان کی معروف کتاب ہے۔
- اسماعیل الموصلی (631ھ)
- بدرالدین الشبلی (631ھ)
- جلال الدین السیوطی (911ھ)، "الوسائل في معرفة الأوائل" ان کی جامع اور اہم کتاب ہے۔
- عبداللہ نشمی: یہ کویت کے معاصر نوجوان اور انسائیکلوپیڈیائی حیثیت کے اونچے درجے کے محقق ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "موسوعة الأوائل التاريخية" کے سولہ مختلف ابواب میں زمانۂ قدیم سے عصرِ حاضر تک کے تقریباً ایک ہزار اوائل اور اوّلیات کا تذکرہ کیا ہے۔

مذکورہ بالا تمام مصنفین عرب ہیں اور ان کی تصانیف عربی میں ہیں۔

اردو میں اوّلیات

اردو میں اوّلیات کے موضوع پر مستقل کام کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب کے درجے میں ہے۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی (حفظہ اللہ) اپنی اس کتاب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''میں نے اس کتاب میں اختصار کے ساتھ برصغیر میں اہل حدیث کی نوقسم کی اوّلیات کی نشان دہی کی ہے۔ اپنی نوعیت کی اس موضوع سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے۔'' (حرفے چند)

گویا یہ کتاب بھٹی صاحب کی اوّلیات صالحات میں شامل ہے۔

ابتدائی زندگی میں مطالعہ کا شوق

بھٹی صاحب کی تازہ ترین کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات'' صفحات

کی تعداد کے اعتبار سے اگرچہ اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہے، لیکن اس اختصار میں اپنے موضوع کی تمام اہم اور ضروری چیزیں ضبطِ تحریر میں آگئی ہیں۔ مجھے اس مختصر کتاب کا مطالعہ کرکے بے حد مسرت ہوئی۔ اس میں اہل حدیث کی نومتنوع اوّلیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان نو اوّلیات کو اگر الگ الگ تفصیل سے بیان کیا جائے تو یہ متعدد ضخیم جلدوں کا مواد بن سکتا ہے اور اگر بہت ہی اختصار سے کام لیا جائے تو کم سے کم نوضخیم جلدیں ضرور بن جائیں۔

محترم بھٹی صاحب کو ابتدائی زندگی ہی میں مطالعہ کتب کا شوق تھا۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ سے انھیں بالخصوص دلچسپی تھی۔ اس میں بھی اہل حدیث کی تگ وتازِ بوقلموں ان کا انتہائی پسندیدہ موضوع تھا۔ اہل حدیث کی تصنیفی مساعی، ان کی تدریسی تگ ودو، ان کی سیاسی جدوجہد اور ان کی مناظرانہ سرگرمیوں سے آگاہ ہونے کی کوشش ہمیشہ بھٹی صاحب کا اصل مقصد رہی۔

ان کی یہ کتاب پڑھ کر ان کے بارے میں بہت کچھ لکھنے کو جی چاہ رہا ہے، لیکن پھر خیال آتا ہے کہ مختصر کتاب پر مختصر مقدمہ لکھنا چاہیے۔ اگر بات آگے بڑھی تو موضوع کے دائرے سے بھی باہر نکل جائے گی اور اختصار کا سلسلہ بھی برقرار نہیں رہ سکے گا۔ البتہ ان کی تصنیفی خدمات سے متعلق چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔

تحریر ونگارش کا آغاز

بھٹی صاحب نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے اجرا کے بعد قلم پکڑا اور تحریر ونگارش کا آغاز کیا۔ یہ اخبار اگست 1949ء میں مولانا محمد حنیف ندوی کے زیرِادارت جاری ہوا تھا۔ بھٹی صاحب اس وقت بائیس تیئیس سال کے نوجوان تھے اور مرکزی جمعیت اہل حدیث کی نظامتِ دفتر ان کے سپرد تھی۔ اخبار جاری ہوا تو انھوں نے اس میں لکھنا شروع کیا۔ قلم کی رفتار چوں کہ صحیح سمت کو جاری رہی تھی، اس لیے جلد ہی انھیں

اس اخبار کے مدیر معاون بنا دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا ندوی ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے تو اخبار کی زمام ادارت بھٹی صاحب کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ انھوں نے سولہ سترہ سال یہ خدمت سر انجام دی اور بھرپور طریقے سے جماعت اہل حدیث اور مسلک اہل حدیث کی ترجمانی کا فریضہ ادا کیا۔ ان کی تحریری تربیت جن بزرگانِ عالی قدر کی نگرانی میں ہوئی وہ ہیں: مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

بھٹی صاحب کے زمانۂ ادارت میں اخبار ''الاعتصام'' کے کئی خاص نمبر شائع ہوئے، جن میں ایک ''حجیت حدیث نمبر'' تھا، جو بڑا ضخیم نمبر تھا اور برصغیر کے متعدد اصحابِ قلم کے مقالات کا خوب صورت مجموعہ۔ یہ نمبر گزشتہ سال دوبارہ چھوٹے سائز پر شائع کیا گیا۔ اس کے مطالعہ سے حدیث اور اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بے شمار معلومات سے قارئین کرام بہرہ مند ہوجاتے ہیں۔

علاوہ ازیں الاعتصام کا ''1857ء نمبر'' مئی 1957ء میں شائع ہوا جو اس موضوع کے بہترین مضامین پر محیط ہے۔ پھر دستور نمبر اور عید نمبر وغیرہ کئی نمبر معرضِ اشاعت میں آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ بھٹی صاحب نے ''الاعتصام'' کی ادارت میں بہت محنت کی اور مندرجات کے اعتبار سے اس اخبار نے بڑی شہرت پائی۔ انھوں نے اپنے قارئین کو صاف ستھری زبان میں صاف ستھرا مواد دیا۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں تصنیفی خدمات

اکتوبر 1965ء میں بھٹی صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے جو ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اس میں انھوں نے خالص تحقیقی نہج سے تصنیفی کام کیا۔ پہلے محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق بغدادی (متوفی 390ھ) کی مشہور عربی کتاب ''الفہرست'' کا جسے دنیاے اسلام کے اوّلیں انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے، اردو

ترجمہ کیا اور حل طلب مقامات پر حواشی لکھے۔ یہ ترجمہ تقریباً ساڑھے نو سو صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ اسی اثنا میں اس کتاب کا فارسی ترجمہ چھپا۔ انگریزی ترجمہ بہت بعد میں ہوا۔ پھر ''برصغیر میں علم فقہ'' لکھی۔ بعد ازاں ''فقہائے ہند'' تصنیف کی جو دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسی ادارے کی طرف سے ایک کتاب انھوں نے ''برصغیر میں اسلام کے اوّلیں نقوش'' لکھی، جس میں بتایا گیا ہے کہ اس خطۂ ارض میں (جسے اب برصغیر پاک وہند کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور بنگلہ دیش بھی اس کا حصہ ہے) پچیس صحابہ کرام، بیالیس تابعین اور اٹھارہ تبع تابعین تشریف لائے۔ اپنے موضوع کی یہ منفرد اور اولیں تصنیف ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے حالات میں انھوں نے ''ارمغانِ حنیف'' تصنیف کی۔ ادارے کے ماہانہ رسالے ''المعارف'' کی ادارت بھی بھٹی صاحب کے سپرد رہی۔

ادارہ ثقافت اسلامیہ میں انھوں نے بتیس برس خدمات سرانجام دیں اور مذکورہ بالا تصانیف وتراجم کے علاوہ اور بھی متعدد قلمی کام کیے، جن کی تفصیل اس مختصر مقدمے میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اس کے لیے یا تو ان کی خود نوشت ''گزر گئی گزران'' پڑھنی چاہیے جو کتاب سرائے اردو بازار لاہور نے شائع کی ہے یا مولانا محمد رمضان سلفی کی مرتبہ کتاب ''مولانا محمد اسحاق بھٹی۔ حیات وخدمات'' کا مطالعہ کرنا چاہیے جو ہندوستان وپاکستان کے مختلف حضرات کے ان مضامین کا خوب صورت مجموعہ ہے جو انھوں نے بھٹی صاحب کے بارے میں بہت سے رسائل وجرائد میں لکھے۔ ان میں میرے ایک عربی مضمون کا اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے جو میں نے کویت کے ماہانہ مجلّے ''أمّتي'' میں لکھا تھا۔ یہ کتاب مکتبہ رحمانیہ ناصر روڈ، سیالکوٹ کی طرف سے چھپی ہے۔

بھٹی صاحب کی خاکہ نگاری پر پنجاب یونیورسٹی (لاہور) سے ایک خاتون پروفیسر نے ایم فل کیا۔ ایم فل کا مقالہ فیصل آباد کے ایک ناشرِ کتب نے شائع کر دیا ہے۔ اس میں بھی بھٹی صاحب کے حالات ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن

25۔دسمبر 1965ء کو بھٹی صاحب کی ریڈیو پاکستان پر پہلی تقریر نشر ہوئی۔اس کے بعد چونتیس سال یہ سلسلہ جاری رہا اور مختلف عنوانات پر بے شمار تقریریں ہوئیں۔ وہ دوسرے پاکستانی اہل حدیث مقرر تھے جنھیں ریڈیو پر تقریروں کا موقع ملا۔ان سے قبل مولانا محمد حنیف ندوی کو ریڈیو پر تقریروں کی دعوت دی جاتی تھی۔ ریڈیو کا ایک پروگرام ''زندہ تابندہ'' تھا۔اس پروگرام میں بھٹی صاحب نے برصغیر کے چالیس سے زیادہ علمائے اہل حدیث کے حالات بیان کیے۔ ایک مرتبہ ریڈیو پر ہفتہ حدیث منایا گیا۔ یعنی سات روز میں حدیث سے متعلق مختلف موضوعات پر سات مقرروں کی تقریریں کرائی گئیں جن میں ایک مقرر بھٹی صاحب تھے۔ ہر تقریر کا دورانیہ پینتیس منٹ تھا۔ بھٹی صاحب کا موضوع رجالِ حدیث تھا۔ انھوں نے اس موضوع پر پورا ایک گھنٹا تقریر کی جو کئی دفعہ نشر ہوئی۔

ٹیلی ویژن پر ان کی پہلی تقریر 27۔جولائی 1972ء کو ہوئی اور پھر کئی سال یہ سلسلہ جاری رہا۔اس کے بعد انھوں نے معذرت کر دی۔

ملازمت سے علاحدگی کے بعد

ادارہ ثقافت اسلامیہ کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھٹی صاحب نے جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں دو کتابوں ''نقوشِ عظمت رفتہ'' اور ''بزمِ ارجمنداں'' میں اہل حدیث کے ساتھ چند غیر اہل حدیث بھی شامل ہیں، لیکن دیگر کتابیں: قافلہ حدیث، کاروانِ سلف، دبستانِ حدیث اور گلستانِ حدیث وغیرہ صرف اہل حدیث اصحابِ علم کے تذکار پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' اور ''برصغیر کے اہل حدیث خدامِ قرآن'' ان کی نہایت اہم تصانیف ہیں جو اہل حدیث علمائے کرام کی علمی کاوشوں کو اجاگر کرتی ہیں۔ ''ہفت اقلیم'' کے صفحات بھی (بجز ایک

بزرگ کے) اہل حدیث اصحابِ علم کی مختلف علمی سرگرمیوں کا خوب صورت آئینہ ہیں۔ چند روز بیشتر ان کی دو تازہ تصانیف منصۂ شہود پر آئی ہیں۔ ایک ''برصغیر میں اہل حدیث کی تدریسی اور تنظیمی سرگزشت'' اور دوسری ہے: ''استقبالیہ اور صدارتی خطبات'' جو مرکزی جمعیت اہل حدیث کی سالانہ کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ یہ کل چوبیس خطبات ہیں۔ ان میں مولانا محمد حنیف ندوی کی ایک پریس کانفرنس بھی شامل ہے جس میں تحریک اہل حدیث اور مسلکِ اہل حدیث کے بارے میں نہایت اہم نکات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ خطبات 368 صفحات پر مشتمل ہیں۔

بھٹی صاحب کی بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو ایک ایک اہل حدیث بزرگ کے حالات کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ وہ ہیں: تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری، تذکرہ میاں عبدالعزیز بیرسٹریٹ لا مالواڈہ، تذکرہ مولانا احمد الدین گکھڑوی، تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی، میاں فضل حق اور ان کی خدمات، تذکرہ صوفی محمد عبداللہ، تذکارِ مولانا محی الدین لکھوی۔ لیکن فاضل مصنف نے ان ایک ایک شخصیت کے حالات میں بے شمار شخصیتوں کے تذکار رقم کر دیے ہیں۔ بعض کتابیں اہل حدیث خاندانوں کے واقعات پر محیط ہیں وہ ہیں: قصوری خاندان اور روپڑی علمائے اہل حدیث۔

بلاشبہ بھٹی صاحب اپنے دور کے ممتاز مصنف ہیں جنھوں نے بہترین کتابیں تصنیف کیں، متعدد رسائل و جرائد کی ادارت کی۔ بے شمار مصنفوں کی کتابوں پر مقدمات لکھے، لاتعداد کتابوں پر تبصرے کیے۔ 1987ء میں انھوں نے ہفت روزہ اخبار ''اہل حدیث'' (لاہور) کا ''حرمین شریفین نمبر'' مرتب کیا جو اردو اور عربی مضامین کا پُراز معلومات مجموعہ ہے اور بڑے سائز کے سیکڑوں صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں مملکت سعودیہ، مقاماتِ مقدسہ، آل سعود اور خاندان شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی پوری تاریخ ضبطِ کتابت میں آگئی ہے۔ معلومات کے اعتبار سے یہ عدیم المثال نمبر ہے۔

بھٹی صاحب کی اب تک کی تحریری مساعی زیرِ مطالعہ کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات'' کے سائز کی پچاس ہزار سے زیادہ صفحات پر محیط ہیں۔ اللہ کے فضل سے ان صفحات میں انھوں نے ہزاروں شخصیات کے تراجم بیان کر دیے ہیں۔ تاریخ وتذکرہ اور سیرت وسوانح کے باب میں میرے نزدیک بھٹی صاحب کی بے لوث خدمات کا برصغیر میں کوئی جواب نہیں۔ ان کے قلم سے شخصیات کے تراجم کی شکل میں جماعت کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے اور ان کی تحریروں سے بہت سی ان گراں قدر شخصیات کو حیاتِ جاودانی ملی جو گوشۂ نسیان میں جا چکی تھیں۔ بھٹی صاحب نے زمانے کی ناہمواریوں اور نرم وگرم حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جس یک سوئی کے ساتھ تاریخ وتراجم کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید کے بغیر ممکن نہ تھا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات

اب آیے پیش نگاہ کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات'' کی طرف۔

اس میں اہل حدیث کی نو اوّلیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس میں اختصار اور جامعیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اہل حدیث کی خدمت قرآن، خدمتِ حدیث، سیاسی تگ وتاز، قادیانیت کے خلاف محاذ آرائی وغیرہ کا تذکرہ لائق مطالعہ ہے۔ سیاسیات کے سلسلے میں حضرت مولانا اسماعیل شہید دہلوی، سید احمد شہید اور ان کے رفقائے کرام کی جدوجہد تاریخ برصغیر کا ایسا حصہ ہے، جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس تحریک نے انگریز کے قلعہ اقتدار کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا احمد اللہ عظیم آبادی اور ان کے عظیم القدر رفقا نے جو قربانیاں دیں، انھیں برصغیر کی سیاسی تاریخ کے عظیم الشان باب کی حیثیت حاصل ہے۔

انگریز حکمرانوں نے ان لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ کر کالے پانی بھیجا اور ان میں سے کتنے ہی حضرات حکومت کے ظلم وستم کا مقابلہ کرتے ہوئے وہیں وفات پا گئے۔ ان کی جادادیں ضبط کی گئیں اور ان کے اخلاف کو بے حد اذیتوں میں مبتلا کیا گیا۔ آزادیِ وطن کے بعد ہندوستان کی حکومت کے سرکردہ ارکان نے ان کے وارثوں سے ان کی ضبط شدہ جادادوں کے بارے میں گفتگو کرنا چاہی تو انھوں نے اس موضوع پر یہ کہہ کر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارے بزرگوں کے نزدیک انگریزوں کو برصغیر سے نکالنا اور ان کی حکومت کو ختم کرنا ضروری تھا۔ وہ اسے کارِ خیر سمجھ کر اس میدان میں اترے تھے، ہم بھی اسے کارِ خیر ہی سمجھتے ہیں۔ اس کا اللہ ہی بہتر بدلہ دے گا۔ اس دنیا میں ہم اس کا ہرگز کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہتے۔

وجہِ تالیف

یہاں چند الفاظ میں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ کتاب کس طرح معرضِ تالیف میں آئی۔ 2008ء کے ماہِ جون کے آخر میں عمرے سے فارغ ہو کر "لجنة القارة الهندية" کی دعوت پر بھٹی صاحب کویت تشریف لائے۔ لجنہ کے ارکان کو ان سے مل کر نہایت خوشی ہوئی۔ تقریباً دو ہفتے ان کا یہاں قیام رہا۔ وہ خوش مزاج، خوش اخلاق اور میل جول والے شخص ہیں۔ مختلف اوقات میں ان کی مجلس میں بے شمار باتیں ہوئیں۔ ایک روز انھوں نے برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات کا تذکرہ کیا تو طبیعت لہرا اٹھی۔ اس مجلس کی تمام باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان سے گزارش کی گئی کہ یہ باتیں آپ قلم بند کر دیں تو ان کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جائے گا۔ انھوں نے اس کا وعدہ تو کر لیا لیکن اپنی تصنیفی مصروفیات کی بنا پر یہ خدمت انجام نہ دے سکے۔ پھر 11۔ ستمبر 2011ء کو انھیں حادثہ پیش آ گیا اور دائیں بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پانچ مہینے کوئی تحریری کام نہ کر سکے۔ ہم ہزاروں میل

دور بیٹھے ان کے لیے دعا ہی کر سکتے تھے اور نہایت اخلاص سے دعا کرتے رہے۔
ٹیلی فون کے ذریعے ان سے باقاعدہ رابطہ رہا۔ فروری 2012ء کے وسط میں انھوں نے قلم پکڑا تو وہ کام مکمل کیے جو حادثے سے پہلے شروع کیے تھے۔ اللہ کا شکر ہے یہ کتاب بھی مکمل ہوگئی۔ اس چھوٹی سی کتاب میں بہت کچھ آگیا ہے۔ اللہ اس کے مصنف کو جزائے خیر سے نوازے۔ میں ذاتی طور پر ان کا نہایت شکرگزار ہوں۔

شکر وسپاس

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ کے طور پر اس محسن ادارہ لجنۃ القارۃ الھندیہ (جمعیت احیاء التراث الاسلامی، کویت) اور اس کے صدرِ گرامی، قدردانِ علم وعلماء شیخ ابو خالد خلاح خالد المطیری کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، جن کی توجہِ خاص سے تصنیف وتالیف جیسے کارِ خیر کی کفالت ہو رہی ہے۔

اس موقع پر برادرِ گرامی شیخ عارف جاوید محمدی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے، جن کی نگرانی میں تصنیف وتالیف کا عمل پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام محسنین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کو دنیا وآخرت کی کامیابیوں سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین۔

الراجی إلی عفو اللہ الصمد

صلاح الدین مقبول احمد

غفر اللہ لہ ولوالدیہ ومشایخہ وإخوانہ وسائر المسلمین

مدینۃ الجہراء۔ کویت

روز شنبہ

14/06/1433 مطابق 09/05/2012

❁❁❁❁❁

حرفِ چند

اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے برصغیر میں جماعت اہل حدیث کے عمل وحرکت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ درس وتدریس میں، تصنیف وتالیف میں، وعظ وخطابت اور دیگر میدانہائے کار میں اس جماعت کے اصحابِ علم نے بے پناہ خدمات سرانجام دیں اور دے رہے ہیں۔ یہ فقیر ایک فریضہ سمجھ کر اپنے محدود علم کے مطابق ان کی خدماتِ بوقلموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب بھی اسی کوشش کا اشاراتی سا ظہور ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ میں کویت گیا اور میں نے وہاں ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے برصغیر کے اہل حدیث کی چند اوّلیات کا ذکر کیا۔ اس مجلس میں میرے عزیز دوست مولانا عارف جاوید محمدی اور مولانا صلاح الدین مقبول احمد بھی موجود تھے۔ یہ دونوں ایک مدت سے کویت میں سکونت پذیر ہیں اور وہاں اپنے پیکر اخلاص اصحاب علم رفقا کے ساتھ بڑی مستعدی سے دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ مولانا عارف جاوید محمدی کا آبائی تعلق پاکستان کے شہر گوجراں والا سے ہے اور مولانا صلاح الدین مقبول احمد کا ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ضلع بلرام پور کے ایک گاؤں ''اونر ہوا'' سے۔!

مولانا صلاح الدین مقبول احمد کے حالات میں نے اپنی کتاب ''دبستانِ حدیث'' میں لکھے ہیں اور مولانا عارف جاوید محمدی کے ''گلستانِ حدیث'' میں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں مسلکِ اہل حدیث کے یہ بہت بڑے مبلغ ہیں اور اس کی اشاعت کے لیے

ہر وقت کوشاں رہنے والے۔!

میری بات سن کر ان دونوں عزیزوں نے مجھے کہا کہ میں کتابی صورت میں اہل حدیث کی ان اوّلیات کی نشان دہی کردوں جو میرے ذہن میں موجود ہیں۔ میں نے اس پر رضامندی کا اظہار تو کردیا لیکن دیگر تصنیفی مصروفیات کی وجہ سے اس کی عملی شکل پیدا نہ ہوسکی۔ پھر یہ ہوا کہ 11۔ستمبر 2011ء کو سڑک کے ایک حادثے میں میرے دائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور تحریر و نگارش کا سلسلہ رک گیا۔

پرائیویٹ ہسپتال میں آپریشن کرایا گیا اور چھ ہفتے کے لیے بازو پلستر کی گرفت میں آگیا۔ پلستر اترنے کے بعد بھی قلم پکڑنے کی سکت نہ تھی۔ اس اثنا میں کویت سے مولانا عارف جاوید محمدی تشریف لائے اور انھوں نے گوجراں والا کے ڈاکٹر طاہر منیر وریاہ سے بات کی، جن کا گوندلاں والا روڈ پہ ہڈی اور جوڑ کا کلینک ہے اور وہ اس مرض کے مشہور معالج ہیں۔ یکم جنوری 2012ء کو محترم حاجی عبداللہ کوثر (جو ڈاکٹر صاحب ممدوح کے سسر ہیں) گوجرانوالا سے گاڑی لے کر آئے اور مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلینک لے گئے۔ معلوم ہوا کہ بازو جام ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے چند دوائیں دیں اور بازو کی ورزش کے متعلق تاکید کی۔ اس طرح ہر پندرہ روز کے بعد حاجی عبداللہ کوثر صاحب گاڑی لاتے اور مجھے وہاں لے جاتے اور شام کو چھوڑ جاتے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے انتہائی کرم فرمایا اور نصف فروری 2012ء (یعنی پانچ مہینے) کے بعد قلم کسی حد تک انگلیوں کی گرفت میں آنے لگا اور ہاتھ میں کچھ جنبش پیدا ہوئی تو پندرہ بیس روز میں اہل حدیث کی اوّلیات کے سلسلے کی چند باتیں معرضِ کتابت میں آگئیں۔ تکلیف تھوڑی بہت اب بھی ہے، لیکن اللہ کی مہربانی سے کام ہو رہا ہے۔

میں جو کچھ لکھتا ہوں یہ اصحابِ علم کی مساعی کے تذکار اور اللہ کے دین کے مبلغوں کے تراجم ہیں۔ اس معصیت کیش کو یقین ہے کہ ان تذکار و تراجم کی برکت

سے بارگاہِ الٰہی میں اس کی پکار ان شاء اللہ سنی جائے گی اور اللہ کے فضل سے تمام امورِ خیر تکمیل کی منزل کو پہنچیں گے۔

میں نے اس کتاب میں اختصار کے ساتھ برصغیر میں اہل حدیث کی نوقسم کی اوّلیات کی نشان دہی کی ہے۔ اپنی نوعیت کی اس موضوع سے متعلق اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اگر خوانندگانِ محترم کو اس کے مندرجات سے اتفاق ہو اور وہ اسے علمی اور واقعاتی اعتبار سے فائدہ مند سمجھیں تو اس فقیر اور اس کے مرحوم والدین کے لیے دعاے خیر فرمائیں۔

محترم شیخ صلاح الدین مقبول احمد نے اس کتاب پر ''کتاب اور مصنف کتاب میری نظر میں'' کے عنوان سے مقدمہ لکھا ہے، جس پر میں ان کا شکرگزار ہوں۔ مقدمے میں انھوں نے میرے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، یہ ان کا حسن ظن ہے۔ بہت لوگ بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں بھی اپنی معلومات کے مطابق تھوڑا بہت لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور پڑھنے والے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی اس فقیر پر مہربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں خوش رکھے۔

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

جناح سٹریٹ۔ اسلامیہ کالونی، سانده۔ لاہور

ٹیلی فون: 042-37143677

یکم مارچ 2012ء

7۔ربیع الثانی 1433ھ

پہلا باب

قرآن مجید کے تراجم وتفاسیر

اس معمورۂ ارض میں جغرافیائی اعتبار سے تین ملکوں (پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیش) کے مجموعے کو برصغیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سہ ملکی مجموعہ بے شمار مذاہب کا دلچسپ گہوارہ ہے، جس میں ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے میں آزاد ہیں۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ کروڑ سے آگے نکل گئی ہے۔ پچیس کروڑ کے قریب مسلمان ہندوستان میں، بیس کروڑ کے لگ بھگ بنگلہ دیش میں اور اٹھارہ کروڑ پاکستان میں آباد ہیں۔ مسلمانوں میں اہل حدیث، حنفی (دیوبندی، بریلوی) مالکی، شافعی، حنبلی، شیعہ، سبھی مسالک کے لوگ شامل ہیں اور اپنے عقیدے اور زاویۂ فکر کی روشنی میں تدریسی اور تصنیفی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ میں ان سطور میں اہل حدیث کی خدمات سے متعلق چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ برصغیر میں علمی، تحقیقی اور تصنیفی معاملات میں ان کی کیا اولیات ہیں اور اس ضمن میں ان کی تگ ودو کے دوائر کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے قرآن مجید سے متعلق ان کی مساعی کا تذکرہ کرتے ہیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ برصغیر میں اس کتابِ ہدیٰ کے ترجمہ وتفسیر کے بارے میں علمائے اہل حدیث نے کیا خدمات سرانجام دیں اور اس باب میں ان کی کیا اولیات ہیں۔ لیکن اس کی وضاحت سے پہلے تھوڑی سی تمہید۔

تفسیر قرآن کا آغاز

قرآن مجید کی تفسیر کا آغاز دورِ صحابہ میں بہ زبان عربی ہوا۔ ابتدا میں اختصار سے

کام لیا گیا، بعد ازاں اس موضوع پر متعدد بڑی بڑی تفاسیر ضبطِ تحریر میں آئیں۔ لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ فارسی وہ اولیں عجمی زبان ہے، جس میں قرآن مجید کے ترجمے کا سلسلہ عہد صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں شروع ہوا۔ علامہ سرخسی کا کہنا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے فارس کے لوگوں کے لیے سورت فاتحہ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔[1]

- لیکن برصغیر میں قرآن مجید کی بعض سورتوں (مثلاً سورت یٰسٓ) کا اولیں ترجمہ سندھی زبان میں ہوا۔[2]
- شیخ شہاب الدین دولت آبادی (متوفی 849ھ... 1445ء) نے ''بحرِ مواج'' کے نام سے فارسی میں قرآن کا ترجمہ کیا اور تفسیر لکھی، لیکن یہ قرآن کے مختلف حصوں کا ترجمہ اور تفسیر تھی۔ پورے قرآن کا ترجمہ تھا نہ تفسیر۔
- شیخ علی متقی (متوفی 2۔ جمادی الاولیٰ 975ھ ... 4۔ نومبر 1587ء) برصغیر کے بہت بڑے عالم اور مصنف تھے۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب ''شئون المنزلات'' میں مختلف قرآنی آیات کے شانِ نزول اور محلِ نزول کا تذکرہ کیا ہے، نیز بعض الفاظ وآیات کی نحوی اور لسانی نقطۂ نظر سے وضاحت کی ہے۔ اس کتاب کو پورے قرآن کے ترجمہ وتفسیر کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔
- ہندوستان کے چوتھے مغل بادشاہ نورالدین محمد جہاں گیر نے گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک عالم محمد بن جلال الدین حسنی گجراتی کو قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کرنے پر مامور کیا اور کہا کہ ترجمہ لفظی اور عام فہم ہونا چاہیے۔ نیز ترجمے کا کوئی لفظ قرآن کے الفاظ سے زائد نہ ہو۔[3]

---

[1] حاشیة موضح القرآن (ص: 12) بحوالہ المبسوط (37/1 مطبوعہ مصر)
[2] تفصیل کے لیے دیکھیے: فقہاے ہند (89/1 تا 91)
[3] نزھة الخواطر (121/5)

معلوم نہیں بادشاہ کی ہدایت کے مطابق ترجمہ ہوا یا نہیں ہوا۔ اگر ہوا تو یہ ترجمہ کہیں موجود بھی ہے یا نہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، یہ ترجمہ کہیں نہیں ہے۔

ان چند تمہیدی الفاظ کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ برصغیر میں پورے قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کا کام سب سے پہلے کن علماے کرام نے کیا اور وہ معرضِ اشاعت میں بھی آیا اور اس کی اشاعت کا سلسلہ اب تک جاری ہے، جس سے لوگوں نے بے حد استفادہ کیا اور کر رہے ہیں۔ تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

فارسی ترجمے

برصغیر کے اولیں عالم دین جنھوں نے پورے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کی تفسیر لکھی وہ شیخ نوح بن نعمت اللہ سندھی ہیں جو صوبہ سندھ کے ایک گاؤں ہالہ کندی کے رہنے والے تھے اور اپنے دور کے جلیل القدر عالم تھے۔ انھوں نے 26۔ذی قعدہ 998ھ (15۔ستمبر 1590ء) کو اپنے مسکن ہالہ کندی میں وفات پائی۔ یہ فارسی ترجمہ پندرھویں صدی ہجری کی تقریب کے موقع پر سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد۔ جامشورو (سندھ) نے 1401ھ میں شائع کیا۔

دوسرے فارسی مترجم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہیں۔ ان کے ترجمہ وتفسیر کا نام ''فتح الرحمٰن'' ہے۔ یہ ترجمہ برصغیر کے بے شمار ناشروں نے بے شمار مرتبہ شائع کیا۔ اس ترجمے کو اہل علم میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور یہ بہت پڑھا گیا۔ برصغیر (پاک وہند اور بنگلہ دیش) کی پوری امتِ مسلمہ نے اسے صحیح تریں ترجمہ قرار دیا اور علما کے تمام حلقوں میں اس سے استفادہ کیا گیا۔

برصغیر میں اصول تفسیر کے موضوع پر بھی سب سے پہلے فارسی زبان میں ''الفوز الکبیر'' کے نام سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے کتاب لکھی۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں علم احکام، علم مخاصمہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ، تذکیر

بالموت وما بعد الموت اور ترتیب نزول وغیرہ اہم امور پر بحث کی گئی ہے۔

"الفوز الکبیر" کی تالیف کا سبب شاہ صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"جب اس فقیر (ولی اللہ) پر اللہ نے قرآن مجید کے فہم کے دروازے کھول دیے تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ چند ایسے مفید نکات بیان کردیے جائیں جو قرآن سے متعلق تدبر وغور کے سلسلے میں لوگوں کے لیے افادے کا باعث ہوسکیں، چنانچہ اس مختصر رسالے میں وہ نکات ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔"

شاہ صاحب کے ایک رسالے کا نام "فتح الخبیر" ہے۔ یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح اور غرائب کی شرح پر محیط ہے۔ اس میں جامعیت کے ساتھ تقریباً وہ سارا مواد سمیٹ لیا گیا ہے جو تفسیر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بہ طریق صحیح منقول ہے۔ یہ بھی برصغیر کے اس عظیم مصنف کی اس موضوع پر اولیں تصنیف ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب 4۔شوال 1114ھ (21۔فروری 1703ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور 29۔محرم 1172ھ (20۔اگست 1762ء) کو وفات پائی۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحب زادۂ گرامی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے فارسی میں "تفسیر فتح العزیز" کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو "تفسیر عزیزی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تفسیر کئی جلدوں میں تھی، (وهو في مجلدات كبار) لیکن 1857ء کے ہنگامے میں ضائع ہوگئی۔ پہلی اور آخری صرف دو جلدیں باقی رہ گئیں۔ [1]

پہلی جلد سورت فاتحہ سے سورت بقرہ کے آخر تک سوا دو پاروں پر مشتمل ہے اور دوسری جلد دو آخری پاروں (انتیسویں اور تیسویں) کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ برصغیر میں فارسی

[1] نزهة الخواطر (273/7)

زبان کی یہ اولیں تفسیر تھی جو بہت مفصل تھی۔ افسوس ہے، دست بردزمانہ کی نذر ہوگئی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی اس خدمتِ قرآن کے علاوہ ان کے ایک شاگرد نے ان کے درسِ قرآن کو قلم بند کر کے سورۃ المومنون سے سورت یٰس تک تقریباً پانچ پاروں کی تفسیر مرتب کی جو ''پنج پارہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی ولادت 22۔ رمضان المبارک 1159ھ (27۔ستمبر 1746ء) کو ہوئی اور وہ 79 سال کی عمر پا کر 7۔شوال 1238ھ (17۔ جولائی 1823ء) کو دہلی میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات پر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ ان کا جنازہ 55 مرتبہ پڑھا گیا۔ یہ بھی شاید برصغیر کے ایک اہل حدیث عالم کی اولیات میں شامل ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ اس سے پہلے یا بعد کسی عالم دین کی اتنی مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی ہو۔

برصغیر کے صوبہ پنجاب کے جس عالم نے پورے قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا، وہ حضرت حافظ محمد لکھوی ہیں۔ ترتیب کے لحاظ سے حافظ صاحب برصغیر کے تیسرے فارسی مترجم ومفسر قرآن ہیں۔ انھوں نے یہ خدمت ''تفسیر محمدی'' کے نام سے سرانجام دی۔ تفسیر محمدی بڑی تقطیع کے اڑھائی ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ قمری حساب سے اس کا آغاز انھوں نے 1286ھ میں کیا اور شوال 1296ھ میں یہ سلسلہ اختتام کو پہنچا۔ (عیسوی حساب سے 1869ء سے 1879ء تک) پورے دس سال وہ اس کارِ خیر میں مصروف رہے۔

حافظ محمد لکھوی کا طریقِ تصنیف یہ ہے کہ پہلے قرآن مجید کی آیت درج کرتے ہیں۔ اس کے نیچے پنجابی ترجمہ لاتے ہیں۔ اس کے نیچے فارسی ترجمہ تحریر فرماتے ہیں، لیکن اس ترجمے کو وہ الفاظ کے تغیر کے ساتھ شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ترجمہ تغیرِ الفاظ ہی کا نام ہے۔ ایک ترجمے کے الفاظ

میں تغیر کیا اور وہ دوسرا ترجمہ قرار پا گیا۔ کسی زبان میں جتنے بھی ترجمے ہوئے ہیں، وہ تغیرِ الفاظ ہی کا نتیجہ ہیں۔ شاہ صاحب کے الفاظ میں تغیر ہوا تو وہ حافظ صاحب کا ترجمہ ہوگیا۔ لیکن حافظ صاحب اسے اپنا ترجمہ نہیں قرار دیتے، بلکہ شاہ صاحب کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کا انکسار ہے۔

پنجابی ترجمے کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ یہ شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی کے اردو ترجمے کا پنجابی ترجمہ ہے۔ اسے بھی ان کے انکسار ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ بہر حال واقعہ یہ ہے کہ حضرت حافظ محمد لکھوی نے قرآن مجید کا دو زبانوں میں ترجمہ کیا، ایک فارسی زبان میں اور ایک پنجابی زبان میں۔ اس طرح وہ ہندوستان کے تیسرے اور متحدہ پنجاب کے پہلے عالم دین ہیں، جنھوں نے قرآن سے متعلق تین قسم کی خدمات سرانجام دیں۔ ایک فارسی ترجمہ، دوسرا پنجابی ترجمہ اور تیسری خدمت ہے اس کی پنجابی نظم میں تفسیر جو بڑے سائز کی سات ضخیم جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور اڑھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

حضرت حافظ محمد لکھوی موجودہ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان کے ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) کے ایک چھوٹے سے گاؤں ''لکھوکے'' میں 1221ھ (1807ء) کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور برصغیر کے جلیل القدر علما سے تحصیل علم کی۔ نہایت ذہین تھے اور غیر معمولی قوتِ حفظ کے مالک۔ وسعتِ مطالعہ کا یہ عالم کہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی انھیں کتب خانہ کہا کرتے تھے۔ حافظ محمد کے دادا حافظ احمد نے اپنے چھوٹے سے گاؤں لکھوکے میں ایک دارالعلوم جاری کیا تھا، حافظ محمد نے 1840ء کے لگ بھگ اس کا نام مدرسہ محمدیہ رکھا، جس میں بے شمار علما وطلبا نے علم حاصل کیا۔ تقسیم ملک کے بعد یہ دارالعلوم ''جامعہ محمدیہ'' کے نام سے اوکاڑہ میں منتقل ہوا۔ اس کے ناظم و مہتمم حضرت حافظ صاحب کے پڑپوتے مولانا معین الدین لکھوی (متوفی

9 دسمبر 2011ء۔ 13 محرم 1433ھ) تھے۔

حضرت حافظ محمد لکھوی بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ آخر صفر 1311ھ (ستمبر 1893ء) میں اپنے مسکن لکھو کے میں فوت ہوئے۔

فارسی زبان میں قرآن مجید سے متعلق ایک کام جامعہ دارالعلوم غواڑی (بلتستان) کے حاجی خلیل الرحمٰن نے کیا۔ انھوں نے قرآن مجید کی ایک سو چودہ سورتوں کا تعارف 62 فارسی اشعار میں کرایا۔ اپنی نوعیت کا یہ ایسا کام ہے جو کسی نے نہیں کیا۔ حاجی خلیل الرحمٰن 20۔ جمادی الاخری 1323ھ (22۔ اگست 1905ء) کو علاقہ بلتستان کے موضع بلغار میں پیدا ہوئے اور عیسوی حساب سے 71 برس کی عمر پا کر مختصر علالت کے بعد 1396ھ (1976ء) کو فوت ہوئے۔

اردو تراجم وتفاسیر

اب قرآن مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کی طرف آیئے۔

قرآن کا پہلا اردو ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی کے فرزند نام دار، حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا اور تفسیر موضح القرآن لکھی۔ اس خدمت سے وہ 1205ھ میں فارغ ہوئے۔ سید عبدالحی حسنی نے اپنے والد مکرم سید فخر الدین حسنی کی کتاب ''سپہر جہاں تاب'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر دہلوی نے خواب دیکھا کہ ان پر قرآن نازل ہوا ہے۔ یہ خواب انھوں نے اپنے برادرِ کبیر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیان کیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نزولِ وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا، لیکن خواب بلاشبہ برحق ہے۔ آپ کے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ خدمتِ قرآن کی ایسی توفیق عطا فرمائے گا جو اس سے پہلے کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔[1] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن مجید کے ترجمے اور تفسیر موضح القرآن

[1] نزهة الخواطر (295/7)

لکھنے کی توفیق عطا فرمائی، جس سے لاکھوں کروڑوں لوگ مستفید ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ان شاء اللہ استفادے کا یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔

بعض اہل علم نے شاہ رفیع الدین دہلوی کے ترجمہ قرآن کو اردو کا پہلا ترجمہ قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلا ترجمہ شاہ عبدالقادر کا ہے، جس کی ایک دلیل ان کا یہ خواب اور اس کی تعبیر ہے۔

شاہ عبدالقادر کی ولادت 1163ھ یا 1164ھ (1750ء یا 1751ء) میں ہوئی اور وہ 19۔ رجب 1230ھ (27۔ جون 1815ء) کو فوت ہوئے۔

اردو زبان میں قرآن مجید کا دوسرا ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب کے بڑے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب نے کیا۔ شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کی طرح اس ترجمے کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے زمانے میں اردو زبان بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی اور کسی دوسری زبان کی کتاب کو اردو میں منتقل کرنا اس وقت انتہائی مشکل تھا۔ بالخصوص قرآن مجید کا ترجمہ بے حد نازک مسئلہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان بزرگانِ دین کو توفیق دی اور یہ مشکل تریں مرحلہ طے ہوگیا۔ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی علوم آلیہ وعالیہ میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ وہ 1162ھ (1749ء) میں پیدا ہوئے اور 6/شوال 1233ھ (9/اگست 1818ء) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

شاہ رفیع الدین صاحب کا ترجمہ قرآن ان کی وفات سے بائیس برس بعد پہلی مرتبہ 1252ھ (1840ء) میں کلکتہ سے شائع ہوا۔ پھر بے شمار ناشروں کی طرف سے بار بار چھپا اور مسلسل چھپ رہا ہے۔ بعض حضرات نے اسے متن قرآن کے ساتھ اکیلا شائع کیا اور بعض نے کسی دوسرے مترجم کے ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

کسی زمانے میں بڑی تقطیع پر تین ترجمے اکٹھے شائع ہوئے تھے۔ متنِ قران

کے ساتھ پہلا شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجمہ تھا۔ دوسرا شاہ رفیع الدین صاحب کا اردو ترجمہ اور تیسرا تھا شاہ عبدالقادر صاحب کا اردو ترجمہ۔ اس طرح تینوں باپ بیٹوں کے یک جا ترجمے معرضِ اشاعت میں آئے اور اسے تین ترجموں والا قرآن کہا جاتا تھا۔ یہ قرآن مجید میرے دادا (میاں محمد مرحوم) کے پاس تھا اور وہ روزانہ صبح کے وقت اسی قرآن پر تلاوت کیا کرتے تھے۔

بہرحال برصغیر میں پہلا مشہور و متداول فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا ہے اور پہلے اردو ترجمے ان کے صاحب زادوں نے کیے۔ اس کے بعد بہت سے اہلِ علم نے ترجمے کیے۔ ڈپٹی نذیر احمد اپنے ترجمۂ قرآن کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''جب ایک خاندان کے ایک چھوڑ تین تین ترجمے لوگوں کو مل گئے، ایک فارسی، مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کا، اکھٹے دو دو اردو، ایک شاہ عبدالقادر اور ایک شاہ رفیع الدین صاحب کا تو ہر ایک کو ترجمے کا حوصلہ ہوگیا، مگر خاندان شاہ ولی اللہ کے سوا کوئی شخص مترجم ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ وہ ہرگز مترجم قرآن نہیں، بلکہ مولانا شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کا مترجم ہے کہ انھی کے ترجموں میں رد و بدل، تقدیم و تاخیر کرکے جدید ترجمے کا نام کردیا ہے۔''

نواب صدیق حسن خاں کی خدمتِ قرآن

نواب صدیق حسن خاں برصغیر کے کثیر التصانیف عالم تھے۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو؛ تینوں زبانوں میں لکھا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، عقائد، شعر و شاعری، ادبیات، اخلاق، تصوف وغیرہ مختلف عنوانات سے متعلق انھوں نے 323 کتابیں تصنیف کیں۔ صرف قرآن مجید کے موضوع پر ان کی سات کتابیں

ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

1...... فتح البيان في مقاصد القرآن: یہ عربی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ پہلے یہ چار جلدوں پر مشتمل تھی اور نواب صاحب کی زندگی میں بھوپال میں شائع ہوئی تھی۔ اشاعت کے بعد نواب صاحب نے اس کے متعدد مقامات پر بہت سے اضافے کیے اور یہ عربی تفسیر دس جلدوں میں پھیل گئی۔ پھر اسے خود ہی مصر سے طبع کرایا۔ بڑے سائز کے یہ چار ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہے۔

2...... ترجمان القرآن بلطائف البیان: یہ تفسیر اردو زبان میں ہے جو پندرہ جلدوں میں مکمل ہوئی۔

3...... تذكير الكل بتفسير الفاتحة وأربع قل: یہ کتاب اردو زبان میں سورت فاتحہ اور سورت قل یا ایُھا الکافرون، سورت اخلاص (قل ھو اللہ احد)، سورت قل اعوذ برب الفلق اور سورت قل اعوذ برب الناس پر مشتمل ہے۔

4...... نيل المرام من تفسير آيات الأحكام: یہ عربی زبان میں ہے اور قرآن مجید کی ان 236 آیات کی تفسیر ہے جو احکام سے تعلق رکھتی ہیں۔

5...... فصل الخطاب في فضل الكتاب: یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور اس میں قرآن مجید کے فضائل بیان کیے گئے ہیں۔ اپنے موضوع کی یہ منفرد کتاب ہے۔

6...... اکسیر في أصول التفسیر: یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور دو حصوں میں ہے۔ حصۂ اول میں کتبِ تفسیر کا تعارف کرایا گیا ہے اور حصۂ دوم میں مفسرین کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس موضوع کی یہ اولیں کتاب ہے جو برصغیر کے ایک اہل حدیث مصنف نے تصنیف کی۔

7...... إفادة الشيوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ: یہ کتاب بھی فارسی میں ہے اور دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں آیاتِ قرآن کے ناسخ ومنسوخ کا ذکر کیا

گیا ہے اور دوسرے حصے میں احادیث کے ناسخ ومنسوخ کا تذکرہ ہے۔

قرآن کے موضوع پر حضرت نواب سید صدیق حسن خاں کی یہ سات کتابیں ہیں، جن میں بعض عربی میں ہیں، بعض فارسی میں اور بعض اردو میں۔! یعنی نواب صاحب نے قرآن سے متعلق ان تینوں زبانوں میں لکھا اور بے حد تحقیق سے لکھا۔ یہ سات کتابیں حجم وضخامت کے اعتبار سے دس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے جو نواب صاحب مرحوم ومغفور نے قرآن کے سلسلے میں سرانجام دی۔ وہ اپنے دور کے برصغیر کے پہلے عالم تھے جنھوں نے قرآن مجید پر اتنی تفصیل سے لکھا۔

نواب صاحب 19۔جمادی الاولیٰ 1248ھ (13۔ نومبر 1832ء) کو پیدا ہوئے اور 29۔جمادی الاخریٰ 1307ھ (17۔فروری 1890ء) کو ان کا انتقال ہوا۔

سید امیر علی ملیح آبادی کی تفسیر

❀ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے مختلف بلاد وقصبات اور دیہات میں بے شمار علما پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ علمی خدمات کے لیے وقف کیے رکھا۔ علما کے اس عالی بخت گروہ میں ایک بزرگ سید امیر علی ملیح آبادی کا اسم گرامی بھی شامل ہے جو لکھنؤ سے کچھ فاصلے پر ایک قصبے ''ملیح آباد'' میں 1274ھ (1858ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ''تفسیر مواہب الرحمٰن'' کے نام سے قرآن مجید کے تیس پاروں کی تفسیر تیس جلدوں میں لکھی، جو پہلی دفعہ مطبع نول کشور لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ پھر اسے دس ضخیم جلدوں میں چھاپا گیا۔ یہ جلدیں 8812 صفحات پر محیط ہیں۔ صوبہ یوپی کے یہ پہلے عالم دین ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے یہ اہم خدمت انجام دینے کے مواقع بہم پہنچائے۔

سید امیر علی ملیح آبادی نے تفسیر مواہب الرحمٰن کے علاوہ قرآن مجید کے سلسلے میں ایک کام یہ کیا کہ فیضی کی غیر منقوط تفسیر ''سواطع الالہام'' پر غیر منقوط مقدمہ لکھا۔ وہ

اولیں عالم ہیں جنھوں نے یہ علمی کام کیا۔ تفسیر مواہب الرحمٰن اور سواطع الالہام دونوں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔ سید امیر علی ملیح آبادی نے 1337ھ (1919ء) میں وفات پائی۔

سید احمد حسن دہلوی

ڈپٹی سید احمد حسن دہلوی 1258ھ (1842ء) میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی اور تصنیف وتالیف اور دینی خدمات میں بڑا نام پایا۔ دہلی کے وہ اولیں اہل علم ہیں جنھوں نے اردو زبان میں ''احسن التفاسیر'' کے نام سے سات جلدوں میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو دو ہزار پانچ سو باسٹھ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پہلی مرتبہ یہ تفسیر حضرت مفسر کی زندگی میں 1325ھ (1908ء) کو مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔ متنِ قرآن کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کا ہے۔

1416ھ (1996ء) میں یہ تفسیر مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور کی طرف سے چھپی۔ اس اشاعت کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مندرج احادیث کی تخریج کر دی گئی ہے۔ نیز احادیث کے راویوں صحابہ کرام کا اشاریہ بنا دیا گیا ہے جو ہر جلد کے آخر میں درج ہے۔ ڈپٹی سید احمد حسن دہلوی تقریباً 80 برس کی عمر پا کر 18۔ جمادی الاخریٰ 1338ھ (9۔ مارچ 1920ء) کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف روانہ ہوئے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کی خدمتِ قرآن

مولانا ثناء اللہ امرتسری متحدہ پنجاب کے پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے ''تفسیر ثنائی'' کے نام سے پورے قرآن مجید کی اردو زبان میں تفسیر لکھی۔ یہ تفسیر آٹھ جلدوں

پر محیط ہے۔ اس کی پہلی جلد 1895ء (1313ھ) میں شائع ہوئی اور آخری جلد 18۔فروری 1931ء (29۔ رمضان المبارک 1349ھ) میں تکمیل کو پہنچی۔ اس میں مناسب مواقع پر مفسرِ عالی قدر نے اپنے دور کے مذاہب (عیسائیت، آریہ سماج، قادیانیت، شیعیت، نیچریت اور انکارِ حدیث وغیرہ) کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے۔ بہ الفاظ دیگر مولانا ممدوح نے تفسیر میں اپنا خاص مناظرانہ رنگ قائم رکھا ہے اور لوگوں کو قرآنی احکام اور اسلام کے اصول سمجھانے کے ساتھ جگہ جگہ ان اعتراضات کے جواب دیے ہیں، جو غیر مسلموں کی طرف سے قرآن وحدیث اور احکامِ اسلام پر کیے جاتے ہیں۔

تقسیم ملک سے قبل مولانا امرتسری نے عربی زبان میں دو تفسیریں لکھیں۔ایک عربی تفسیر جس کا نام "تفسیر القرآن بکلام الرحمن" ہے۔یعنی قرآن کی تفسیر قرآن کی آیات سے۔ اپنی نوعیت کی یہ منفرد تفسیر ہے جو 1903ء (1321ھ) میں شائع ہوئی۔ یہ پہلی عربی تفسیر ہے جو متحدہ پنجاب کے ایک عالم نے لکھی۔ دوسری عربی تفسیر "بیان الفرقان علیٰ علم البیان" ہے۔ یہ تفسیر مولانا موصوف نے علم معانی وبیان کے نقطۂ نظر سے لکھنا شروع کی تھی۔ اس کی پہلی جلد سورت بقرہ تک پہنچی تھی۔ اس کے آخر میں دوسری جلد لکھنے کے الفاظ تحریر فرمائے ہیں، لیکن لکھی نہیں گئی۔ اس جلد کا سال طباعت 1934ء (1353ھ) ہے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری 1868ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے اور انھوں نے 15۔مارچ 1948ء کو سرگودھا میں وفات پائی۔

مولانا محمد حنیف ندوی

دوسرے اہل حدیث عالم جنھوں نے متحدہ پنجاب میں بزبانِ اردو پورے قرآن کی تفسیر لکھی، وہ مولانا محمد حنیف ندوی ہیں۔ان کی تفسیر کا نام "سراج البیان" ہے۔ یہ تفسیر پہلی مرتبہ 1934ء میں چھپی۔ زبان اور اسلوبِ بیان کے لحاظ سے یہ نہایت عمدہ تفسیر ہے۔

مولانا محمد حنیف ندوی کو قرآن اور علومِ قرآن سے خاص تعلق تھا۔

مولانا ممدوح 1925ء سے 1930ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تحصیلِ علم کرتے رہے۔ اس اثنا میں انھوں نے قرآن کی مختلف تفسیروں کا بھرپور مطالعہ کیا اور اس موضوع پر تخصص کی سند حاصل کی۔

مولانا محمد حنیف ندوی 10۔جون 1908ء کو گوجراں والا میں پیدا ہوئے اور انھوں نے 12۔جولائی 1987ء کو لاہور میں وفات پائی۔

مولانا ابوالقاسم بنارسی

مولانا ابوالقاسم بنارسی پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اردو زبان میں ''جمع القرآن والحدیث'' کے نام سے کتاب لکھی اور ثابت کیا کہ قرآن مجید نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ میں اسی ترتیب سے جمع ہو گیا تھا، جس ترتیب میں اس وقت موجود ہے اور لوگ اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح حدیث پاک کی جمع وتدوین کے سلسلے کا آغاز بھی نبی مکرم ﷺ کے عہدِ بابرکت میں صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کر لیا تھا اور بے شمار احادیث جمع ہو گئی تھیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ انجمن اہل حدیث مسجد مبارک لاہور نے شائع کی تھی۔

مولانا ابوالقاسم بنارسی یکم شوال 1307ھ (21۔مئی 1890ء) کو بنارس میں پیدا ہوئے اور 3۔صفر 1369ھ (25۔نومبر 1949ء) کو ان کی وفات ہوئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کی وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں، جنھوں نے اپنی علمی رفعت اور فضائل بوقلموں کی وجہ سے پوری دنیا میں شہرت پائی۔ باقاعدہ تحریری اور خطابتی سرگرمیوں کا آغاز انھوں نے قرآن مجید سے کیا۔ اس کتاب ہدیٰ سے انھیں بے حد تعلقِ خاطر تھا۔ ترجمان القرآن کے نام سے انھوں نے ترجمہ وتفسیر کا کام شروع کیا۔ یہ تفسیر سورت فاتحہ سے سورت نور کے اختتام تک چار جلدوں میں چھپی۔ افسوس

ہے باقی مسودہ گم ہوگیا۔ ان کی اس تفسیر میں سے سورت فاتحہ، سورت یوسف اور سورت کہف کی تفسیریں بالخصوص بہت مفصل اور تحقیقی اعتبار سے نہایت معرکہ آرا تفسیریں ہیں، جو الگ الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہوچکی ہیں۔ نہ صرف اردو زبان میں بلکہ کسی زبان میں بھی اس قسم کی محققانہ اور عالمانہ تفسیریں نہیں لکھی گئیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے قرآن مجید کی روشنی میں نبی کریم ﷺ کی سیرت بھی لکھی۔ ایک کتاب امثال القرآن تصنیف کی۔ نیز قرآن کی روشنی میں انھوں نے الکلم الطیب، الدین الخالص، البرہان، قانونِ نشوارتقا، حقیقتِ ایمان وکفر ونفاق، خصائص مسلم وغیرہ کتابیں تصنیف کیں، جو اپنے موضوع میں خاص انفرادیت رکھتی ہیں۔ ان کا تمام تر دعوتی سلسلہ قرآن مجید کی روشنی میں جاری رہا۔ برصغیر کے اہل علم انھیں ہندوستان کا ابن تیمیہ کہا کرتے ہیں۔

اس نابغۂ روزگار شخصیت کی ولادت مکہ مکرمہ میں یکم ذو الحجہ 1305ھ (9۔ اگست 1888ء) کو ہوئی اور 22۔فروری 1958ء (2۔شعبان 1377ھ) کو دہلی میں وفات پائی۔

اردو نظم میں ترجمہ قرآن

عبدالعزیز خالد عربی، فارسی، اردو، انگریز، ہندی؛ متعدد زبانوں پر ماہرانہ عبور رکھتے تھے، اونچے مرتبے کے شاعر تھے۔ 33 کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے تین کتابیں نثر میں ہیں اور تیس ان کی شاعری کے مجموعے ہیں۔ ان کا شمار پاکستان کے بڑے سرکاری افسروں میں ہوتا تھا۔ وہ پہلے اہل علم ہیں، جنھوں نے شروع سے آخر تک پورے قرآن مجید کا منظوم اردو ترجمہ کیا اور وہ ترجمہ اہل علم میں بڑا مقبول ہوا۔ مولانا محمد حنیف ندوی کے وہ بے حد عقیدت مند تھے اور علومِ قرآن میں انھیں سند قرار دیتے تھے۔

عبدالعزیز خالد 15۔جنوری 1927ء (10۔رجب 1345ھ) کو موضع

پرجیاں ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے اور 28۔ جنوری 2010ء (12۔صفر 1431ھ) کو لاہور میں فوت ہوئے۔

پنجابی، سندھی، بلوچی، پشتو ترجمے

قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے ضمن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد حافظ محمد لکھوی کے فارسی ترجمے اور ان کی پنجابی نظم کی ''تفسیر محمدی'' اور پنجابی ترجمے کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ اب قرآن کے ایک اور پنجابی ترجمے کے متعلق سنیے! یہ ترجمہ ایک جلیل القدر عالم مولانا ہدایت اللہ نوشہروی کا ہے۔ وہ ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''نوشہرہ ککے زیاں'' کے رہنے والے تھے اور ککے زی برادری کے فرد تھے۔ اپنے گاؤں کے بعض اساتذہ سے چند کتابیں پڑھنے کے بعد سیالکوٹ آئے اور وہاں کے اہل علم سے مستفید ہوئے۔ بعد ازاں عازم لاہور ہوئے اور اس شہر کے اصحابِ علم سے اخذِ فیض کیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی سے کچھ عرصہ بعد لاہور سے پیدل دہلی پہنچے اور وہاں حضرت میاں سید نذیر حسین سے تحصیل علم کی۔ دہلی میں علم طب بھی پڑھا۔ طویل مدت وہاں گزاری۔ دہلی سے چل کر امرتسر آئے اور حضرت سید عبداللہ غزنوی کے حلقۂ بیعت میں شامل ہوئے۔ 1882ء (1299ھ) کے بعد اپنے گاؤں ''نوشہرہ ککے زیاں'' آئے۔ وہاں تھوڑا عرصہ ہی قیام رہا۔ پھر راولپنڈی چلے گئے اور وہاں طبابت کرنے لگے۔ راولپنڈی کی مسجد اہل حدیث میں امامت و خطابت کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ قرآن مجید کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا اور سورت فاتحہ کی پنجابی میں تفسیر لکھی۔

1911ء (1329ھ) میں کسی کام کے سلسلے میں راولپنڈی سے سیالکوٹ آئے اور بیمار ہوگئے۔ تیسرے دن سیالکوٹ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی نے غسل دیا اور نماز جنازہ پڑھائی۔ وہیں منگا شاہ کے قبرستان میں عیدگاہ کی

دیوار کے ساتھ انھیں دفن کیا گیا۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، خالص پنجابی زبان میں قرآن مجید کے دو ترجمے ہوئے جو اہل حدیث علما نے کیے۔ ایک ترجمہ حافظ محمد لکھوی (متوفی صفر 1311ھ...... ستمبر 1893ء) نے کیا اور ایک مولانا ہدایت اللہ نوشہروی (متوفی 1329ھ...... 1911ء) نے۔

❀ مولانا عبدالتواب ملتانی کا شمار برصغیر کے رفیع المنزلت علما میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے شہر ملتان میں مکتبہ سلفیہ کے نام سے تصنیف وطباعت کا سلسلہ بھی شروع کیا اور مدرسہ بھی جاری کیا، جس میں ان سے بہت سے علماو طلبا نے تحصیل علم کی۔ وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے سرائیکی (یا ملتانی) زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔ اس کے ساتھ اردو ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی کا تھا، لیکن افسوس ہے یہ ترجمہ گم ہوگیا۔ صرف پہلے اور تیسویں دو پاروں کا ترجمہ محفوظ رہا، جسے شائع کر دیا گیا۔ مولانا عبدالتواب ملتانی کو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

مولانا عبدالتواب ملتانی 31۔اگست 1871ء (14۔جمادی الاخریٰ 1288ھ) کو ملتان میں پیدا ہوئے اور 29۔مئی 1947ء (9۔رجب 1366ھ) کو ملتان میں وفات پائی۔

❀ ریاستی زبان یعنی ریاست بہاول پور کی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ مولانا محمد حفیظ الرحمٰن حفیظ نے کیا جو 1372ھ (1953ء) میں عزیز المطابع بہاول پور سے شائع ہوا۔ یہ زبان ملتانی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ مولانا محمد حفیظ الرحمٰن حفیظ کے حالات کا علم نہ ہوسکا۔ ریاستی ترجمے والا قرآن مجھے مولانا ابوحمزہ عبدالحمید سلفی (مسلم کالونی سٹریٹ نمبر 2۔ خیر پور سادات، علی پور ضلع مظفر گڑھ) نے عنایت

فرمایا۔ اس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

☆ مولانا عبدالغفار ضامرانی اولیں عالم تھے جنھوں نے بلوچی زبان میں ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا۔ یہ سلسلہ پچیس پاروں تک پہنچا تھا کہ انھیں دل کا دورہ پڑا اور کراچی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ مولانا ممدوح صوبہ بلوچستان کے علاقے مکران کے ایک پہاڑی مقام ''ضامران'' میں 1934ء (1352ھ) میں پیدا ہوئے اور 31۔مئی 2004ء (11۔ربیع الثانی 1425ھ) کو وفات پائی۔

☆ مولانا عبدالسلام رستمی ماہ رمضان 1359ھ (نومبر 1940ء) میں بہ مقام رستم ضلع مردان صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے۔ پہلے دیوبندی حنفی تھے اور حنفی مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اہل حدیث مسلک اختیار کر لیا اور درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں بے حد خدمات سرانجام دیں۔ پشتو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا اور تفسیر بھی لکھی، جو 1666 صفحات پر محیط ہے۔ اس کا نام ''تفسیر القرآن الکریم'' ہے۔ اس کی اشاعت کا اعزاز مولانا عبدالمالک مجاہد کے قائم کردہ اشاعتی ادارے ''دارالسلام'' کو حاصل ہوا۔ بہترین کاغذ، خوب صورت طباعت اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ پشتو زبان کا یہ ترجمہ وتفسیر ایک عمدہ تریں تحفہ ہے جو پہلی مرتبہ شائقینِ علومِ قرآن کو ملا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

✿ پاکستان کے ایک عالم مولانا احمد ملاح تھے، جو صوبہ سندھ کی تحصیل بدین کے ایک گاؤں کنڈی میں 1868ء (1284ھ) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ آہستہ آہستہ علم حاصل کر لیا۔ سیاسیات سے دلچسپی پیدا ہوئی تو تحریکِ خلافت اور آزادی کی دیگر تحریکوں میں حصہ لیا اور قید ہوئے۔ 1932ء میں مسلک اہل حدیث سے وابستگی اختیار کی۔ پھر اللہ نے توفیق دی تو

سندھی نظم میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ اس سے قبل سندھی نظم میں ترجمۂ قرآن کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ سندھی زبان کا یہ منظوم ترجمہ تیرہ سال کی مدت میں مکمل ہوا۔ اس کا نام انھوں نے ''نور القرآن منظوم ترجمۃ القرآن'' رکھا۔ یہ ترجمہ 1415ھ (1994ء) میں سعودی حکومت کی طرف سے شائع ہوا۔

سندھ میں مولانا احمد ملاح کے زمانے میں ایک عظیم فتنے نے سر اٹھایا۔ بدین کے قریب ''لواری'' نام کی ایک خانقاہ ہے، جہاں ابتدا میں تو عرس اور میلے کا سلسلہ چلتا تھا، مگر 1938ء میں باقاعدہ طور پر یہ اعلان کیا گیا کہ آئندہ 9 ذوالحجہ کو لواری میں غریبوں کے لیے خطبۂ حج پڑھا جائے گا اور پراپیگنڈہ کیا گیا کہ جو شخص حج کے دنوں میں لواری کی درگاہ پر بہ ارادہ حج حاضری دے گا، وہ عنداللہ حاجی اور ناجی ہے۔ درگاہ کے باہر ایک بورڈ پر یہ الفاظ تحریر کیے گئے:

''حاجی، ناجی، غازی کو صد مبارک، صد سلام، خطبہ حج تین بجے دیا جائے گا۔''

یہاں تک کہ (نعوذ باللہ) لواری کی زمین کو مکہ اور مدینہ کہا گیا۔ آب زم زم، عرفات اور جنت البقیع کے نام بھی تجویز کیے گئے۔

اس مشرکانہ اور اسلام سے باغیانہ سازش کے متعلق سن کر نہ صرف صوبہ سندھ بلکہ ہر اُس جگہ سے جہاں جہاں یہ روح فرسا خبر پہنچی، موحدین کے کارواں یکے بعد دیگرے بدین پہنچنے لگے۔ ان میں افغانی بھی تھے، سندھی بھی تھے، بلوچی بھی تھے اور پنجاب کے لوگ بھی تھے۔ اس کاروانِ توحید کی قیادت مولانا احمد ملاح کر رہے تھے۔ انھوں نے وہاں پہنچتے ہی اعلان کیا کہ حج کے لیے اللہ نے صرف مکہ مکرمہ کا انتخاب کیا ہے۔ ہم لوگ مر جائیں گے، لیکن لواری یا کسی بھی جگہ یہ حرکت نہیں کرنے دیں گے جو تم کرنا چاہتے ہو۔ انگریزی حکومت کا زمانہ تھا، مولانا کو گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ بالآخر مولانا احمد ملاح کامیاب ہوئے اور لواری کا ''حج'' کرنے

والے ناکام ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ یہ بہت بڑا فتنہ تھا جو 1938ء میں ظہور میں آیا اور مولانا احمد ملاح کی جرأت مندانہ تحریک سے ختم ہوا۔

مولانا احمد ملاح سو سال کی عمر پا کر 19۔جولائی 1968ء (22۔ربیع الثانی 1388ھ) کو فوت ہوئے۔

❁ سید بدیع الدین شاہ راشدی صوبہ سندھ کے بہت بڑے علمی خاندان کے عظیم المرتبت عالم تھے۔ انھوں نے عربی، اردو، سندھی میں 108 کتابیں تصنیف کیں۔ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے خطیب بھی تھے۔ فنِ رجال میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔ قرآن وحدیث کے تمام گوشوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ وہ برصغیر کے واحد عالم ہیں جنھوں نے سندھی زبان میں ''بدیع التفاسیر'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تفسیر کو علاقہ سندھ میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

سید بدیع الدین شاہ راشدی 10۔ جولائی 1925ء (19۔ذی الحجہ 1343ھ) کو گوٹھ پیر آف جھنڈا (ضلع حیدرآباد سندھ) میں پیدا ہوئے اور انھوں نے 8۔جنوری 1996ء (16۔شعبان 1414ھ) کو وفات پائی۔

بنگلہ زبان میں تراجم وتفاسیر

اب بنگلہ زبان کے تراجم وتفاسیر کے متعلق سنیے!

بنگالی زبان میں قرآن مجید سے متعلق بہت سے اہل علم نے خدمات سرانجام دیں اور اس کی چند سورتوں کا ترجمہ کیا اور اس کی تفسیریں لکھیں۔ غالباً مکمل قرآن کا پہلا بنگالی ترجمہ مولانا عباس علی نے کیا۔ مولانا ممدوح 1859ء میں پیدا ہوئے۔ والد گرامی کا نام منشی تمیز الدین تھا۔ وہ چاندی پور شیر ہاٹ 24 پرگنہ کے رہنے والے تھے۔

مولانا عباس علی نے پہلے قرآن کے آخری پارے کا ترجمہ اکتوبر 1907ء میں

کلکتہ سے شائع کیا جو چند روز میں ختم ہو گیا۔ اس سے دو مہینے بعد دسمبر 1907ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ وہ بھی لوگوں نے نہایت دلچسپی سے خریدا اور پڑھا۔ اس کے بعد انھوں نے پورے قرآن مجید کا ترجمہ مع تفسیر 1909ء میں الطافی پریس کلکتہ سے خود شائع کرایا۔ یہ ترجمہ 967 صفحات پر مشتمل تھا۔ قرآن کے متن کے ساتھ پہلا اردو ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کا تھا اور دوسرا مولانا عباس علی کا بنگالی زبان کا ترجمہ۔ بنگالی اور اردو زبانوں میں مختصر تفسیر بھی تھی۔ یہ ترجمہ صوبہ بنگال میں بہت مقبول ہوا اور بہت پڑھا گیا۔ تھوڑے عرصے میں اس کے چھے ایڈیشن چھپے۔ اس کے بعد کلکتہ سے بار بار چھپا۔

مولانا عباس علی نے 1932ء میں وفات پائی۔

❀ مولانا محمد اکرم خاں بنگال کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے برصغیر کی آزادی کے لیے بے حد کوشش کی اور حالات کے مطابق اپنے زمانے کی سیاسی جماعتوں کانگرس، مسلم لیگ، آل انڈیا مجلس خلافت، جمعیتِ علماے ہند وغیرہ میں شمولیت کی اور ان کے پلیٹ فارم پر سرگرم کار ہوئے۔ آزادیِ وطن کے سلسلے میں کئی سال جیلوں میں رہے۔ صحافت کے میدان میں بھی بڑی شہرت پائی اور بنگلہ زبان میں تین اخبار جاری کیے، وہ تھے (1) سیوک (2) زمانہ اور (3) روزنامہ آزاد۔ بنگلہ زبان میں ان کا ایک ہفت روزہ ''اخبار محمدی'' تھا۔ ان تمام اخبارات کی زمامِ ادارت انھی کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولانا عبدالباری تھا۔ دونوں باپ بیٹا حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ مولانا محمد اکرم خاں نے جیل میں قرآن مجید کا بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا۔ مولانا موصوف تقریباً 1867ء میں پیدا ہوئے اور سو سال کے لگ بھگ عمر پا کر 18۔ اگست 1968ء کو فوت ہوئے۔

برصغیر میں انگریزی ترجمہ

انگریزی ترجمے کے بارے میں بھی پڑھیے۔

❀ قرآن مجید کا پہلا انگریزی ترجمہ 1905ء میں ڈاکٹر عبدالحکیم خاں نے کیا جو موجودہ مشرقی پنجاب کے شہر پٹیالہ کے رہنے والے تھے۔ وہ کچھ عرصہ مرزائیت کے دائرے میں بھی رہے۔ پھر اللہ نے کرم فرمایا اور مرزائیت سے تائب ہوگئے۔ انگریزی کے علاوہ انھوں نے قرآن کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحکیم خاں کے انگریزی ترجمے سے پہلے یورپ کی زبانوں میں غیر مسلم ہی قرآن مجید کا ترجمہ کرتے تھے۔ ترجمے کی صحت کا کوئی التزام نہ تھا۔[1]

ڈاکٹر عبدالحکیم خاں کا انتقال 1359ھ (1940ء) کو ہوا۔

☆ قرآن مجید کا ایک انگریزی ترجمہ مرزا حیرت دہلوی نے کیا۔ ان کا نام محمد امراؤ بیگ تھا اور مرزا حیرت دہلوی کے عرف سے معروف تھے۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ یکم جنوری 1868ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور 1928ء (1346ھ) کو دہلی میں وفات پائی۔ برصغیر میں قرآن کے انگریزی ترجمے کی اولیت کا اعزاز بھی اہل حدیث کو حاصل ہوا۔

❀❀❀❀❀

---
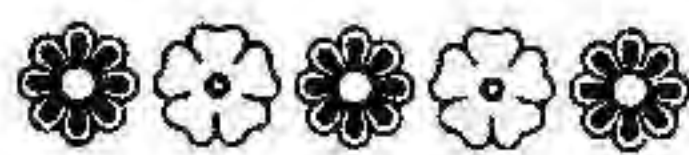
(1) دیباچہ انگریزی ترجمہ عبداللہ یوسف علی (ص: 13)

دوسرا باب

کتبِ حدیث کے تراجم وشروح

برصغیر میں قرآن سے متعلق اہل حدیث کی اولیات کا ذکر گزشتہ صفحات میں اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے، اب حدیثِ رسول (ﷺ) کے بارے میں ان کی اولین مساعی کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن اس سے قبل چند ضروری گزارشات ملاحظہ ہوں۔

برصغیر کے لاتعداد اصحابِ علم نے انتہائی اہتمام کے ساتھ حدیثِ رسول (ﷺ) کی خدمت کی اور کر رہے ہیں۔ کسی نے درس وتدریس کے ذریعے یہ فریضہ سرانجام دینے کا عزم کیا۔ کسی نے مختلف کتبِ حدیث کی شروح وتعلیقات کو ضبط تحریر میں لانے کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی۔ کسی نے کسی کتاب کے اردو یا کسی اور زبان میں ترجمے کو ضروری قرار دیا۔ کسی صاحب نے تخریج کو موضوعِ تحقیق ٹھہرایا اور کسی نے اقسامِ حدیث کی وضاحت کی۔ خدمتِ حدیث کے یہ تمام طریقے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ اہل حدیث علمائے کرام نے بالخصوص اس عظیم الشان کام کی طرف اعتنا کیا اور ان کی تگ وتاز سے علومِ حدیث کی اشاعت کا دائرہ بے حد وسیع ہوا، اور پھر معاملہ یہاں تک بڑھا کہ اس سلسلے میں ان کے عزم وہمت کی وجہ سے اس نے ایک بہت بڑی تحریک کی شکل اختیار کرلی، جسے شیخ محمد منیر دمشقی ''نہضہ عظیمۃ'' سے تعبیر کرتے ہیں اوراس کا تذکرہ کرتے ہوئے مصر کے چودھویں صدی ہجری کے ممتاز مصنف ومحقق علامہ سید رشید رضا بڑی وضاحت سے تحریر فرماتے ہیں:

''لولا عناية إخواننا علماء الهند في هذا العصر لقضى عليها بالزوال من أمصار الشرق، فقد ضعف في مصر و الشام

والعراق والحجاز منذ القرن العاشر للهجرة حتى بلغت منتهى الضعف في أوائل هذا القرن الرابع عشر"[1]

یعنی ہندوستان کے علمائے اہل حدیث نے علومِ حدیث کے تحفظ کی طرف خاص طور پر توجہ مبذول کی۔ اگر اس دور میں ہمارے یہ بھائی ایسا نہ کرتے تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہوجاتا۔ مصر، شام، عراق اور حجاز میں تو یہ علم دسویں صدی ہجری سے روبہ زوال ہوگیا تھا اور چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں زوال کی انتہا تک پہنچ گیا تھا۔

اعترافِ حقیقت

ہندوستان یعنی برصغیر کے اہل علم نے نشرواشاعتِ حدیث کے لیے جو بھرپور کوششیں کیں، ان کا ذکر علامہ رشید رضا کے علاوہ عرب ممالک کے بعض اور اصحابِ تحقیق نے بھی کیا ہے۔ خود ہندوستان کے معروف حنفی عالم مولانا مناظر احسن گیلانی نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں بنیادی کام اہل حدیث علمائے کرام ہی کا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

> "اس کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اپنے دین کے اساسی سرچشموں (قرآن وحدیث) کی طرف توجہ ہندوستان کے حنفی مسلمانوں کی جو پلٹی، اس میں اہل حدیث اور غیر مقلدین کی اس تحریک کو بھی دخل ہے۔ عمومیت غیر مقلد تو نہ ہوئی، لیکن تقلید جامد اور کورانہ اعتماد کا طلسم ضرور ٹوٹا۔"[2]

جماعتِ احناف ہی کے ایک بزرگ مولانا سید رشید احمد ارشد کا ایک مقالہ "ہندو پاکستان میں علم حدیث" کے عنوان سے ماہنامہ "البلاغ" (کراچی) میں شائع ہوا

[1] مقدمہ مفتاح کنوز السنہ، طبع دوم 1987ء (1408ھ)، سہیل اکیڈمی، لاہور۔

[2] ماہنامہ "برہان" دہلی۔ اگست 1985ء۔

تھا۔ اس مقالے میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''آخری زمانے میں حدیث کی تدریس واشاعت سے ہندوستان میں اہل حدیث کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا تھا جو ائمہ کی تقلید کی مخالفت کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے حنفی علما میں بھی کتب حدیث کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور وہ فقہی مسائل کو احادیث کی روشنی میں ثابت کرنے پر متوجہ ہوئے۔ اس طرح اس فرقے کا وجود علم حدیث کی ترقی کا باعث بنا۔''[1]

ان سطور میں مقالہ نگار نے اہل حدیث کے خلاف تعصب کا جو زہریلا انداز اختیار کیا ہے، وہ تو بالکل ظاہر ہے اور ہم اس وقت اس سے تعرض نہیں کرنا چاہتے، یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اہل حدیث کے متعصب تریں مخالف بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں کہ برصغیر میں نبی اقدس ﷺ کی احادیث مبارکہ کے اصل مبلغ اہل حدیث ہیں۔ احناف نے اہل حدیث کو دیکھ کر اس موضوع کی طرف توجہ کی اور وہ بھی صرف اس لیے کہ کھینچ تان کر احادیث سے اپنے چند فقہی مسائل ثابت کرسکیں اور یہ کارِ خیر ماشاء اللہ وہ انجام دے رہے ہیں۔

اہل حدیث فرقہ نہیں

واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اہل حدیث کوئی ایسا فرقہ نہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوا، بلکہ اسلامی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس ملک کے لوگ پہلی صدی ہجری ہی میں اسلام سے آشنا ہوگئے تھے اور نبی اکرم ﷺ کے فرامین وارشادات سے انھیں آگاہی حاصل ہونے لگی تھی، اس لیے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد باسعادت (15 ہجری) میں اس سرزمین میں صحابہ کرام کی آمد شروع ہوگئی تھی، پھر تابعین اور تبع تابعین کا ورودِ سعید بھی یہاں ہوا۔ اس پاک باز جماعت کے ذی شان ارکان

[1] ماہنامہ ''البلاغ'' کراچی۔ ذوالحجہ 1387ھ۔

حدیثِ رسول (ﷺ) اپنے ساتھ لے کر آئے تھے، جس کی انھوں نے یہاں تبلیغ کی اور اس سرزمین کے باشندے اس سے متاثر ہوئے۔ اس کے نتیجے میں بہت سے مقامات پر قال اللہ وقال الرسول کی دل نواز صدائیں گونجنے لگیں۔ لیکن اس زمانے میں آبادیوں کا یہ قرب واتصال نہ تھا جو بعد میں ہوا۔ انسانی آبادی کا دائرہ محدود تھا اور لوگ ایک دوسرے سے دور دراز مقامات پر رہتے تھے۔ نہ تحریر وکتابت کا کوئی قابل ذکر سلسلہ تھا، نہ اس وقت تصنیف وتالیف کا اس نواح میں کوئی رواج ہوا تھا، نہ مدارس وجامعات کا قیام عمل میں آیا تھا اور نہ مطابع کا کوئی تصور کہیں پایا جاتا تھا۔ پڑھنے پڑھانے اور حدیث کی تعلیم وتعلم کا دائرہ بہت محدود تھا، تاہم جو تھا وہ مؤثر تھا اور اس کے اثرات وآثار آہستہ آہستہ پھیلتے گئے۔

اشاعتِ حدیث کی لہر۔

تیرھویں اور چودھویں صدی ہجری میں پوری دنیا میں ترقی کی لہر اٹھی اور پھر تعلیم کا رواج بھی عام ہوا۔ مدارس بھی وسیع تعداد میں جاری ہوئے، تصنیف وتالیف کے لیے بھی فضا ہموار ہوئی، مطابع بھی قائم ہوئے اور کتابوں کی نشر واشاعت بھی عام ہونے لگی۔ برصغیر کے لوگوں پر بھی اس کا اثر پڑا اور وہ اپنے اپنے انداز میں مصروفِ عمل ہوئے۔ اسی دور (بارھویں صدی ہجری) میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تبلیغی وتصنیفی مہمات نے شہرت پائی۔ پھر ان کے صاحب زادگانِ گرامی قدر (حضرت شاہ عبدالعزیز محدث، حضرت شاہ رفیع الدین اور حضرت شاہ عبدالقادر) اور ان کے شاگردوں کی تدریسی وتصنیفی خدمات کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ مولانا اسماعیل شہید، میاں سید نذیر حسین دہلوی، نواب سید صدیق حسن خاں، مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی، مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا ابومحمد ابراہیم آروی، حافظ محمد لکھوی، سید عبداللہ غزنوی، امام سید عبدالجبار غزنوی،

مولانا حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور دیگر بہت سے حضراتِ عالی قدر اسی سلسلة الذہب کے تابندہ موتی ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

ان تمہیدی کلمات کے بعد آگے چلیے!

شاہ ولی اللہ دہلوی کی خدمتِ حدیث

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کے سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں وہ گزشتہ صفحات میں قارئینِ کرام کے علم میں آئیں۔ حالات کے مطابق اپنے زمانے میں نبی مکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کی بھی انھوں نے بے حد خدمت کی۔ حجاز مقدس میں وہاں کے رفیع المرتبت اساتذہ سے حدیث پڑھی اور اس کے متعلقہ علوم پر عبور حاصل کیا۔ اس کے بعد واپس ہندوستان تشریف لائے تو اس بنیادی علم کو مزید مرکزِ التفات ٹھہرایا۔ اس سے قبل چوں کہ برصغیر کے مدارس دینیہ میں علم حدیث کی زیادہ ترویج نہ تھی، اس لیے انھوں نے اس علم کے فروغ واشاعت کو اپنا مطمح نظر ٹھہرایا۔ اس کے لیے تحریری خدمت بھی سرانجام دی اور تدریسی بھی۔

تحریری خدمت یہ کہ موطا امام مالک کی دو شرحیں لکھیں۔ موطا امام مالک حدیث کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ اس کی ترتیب اور اسلوب سے شاہ صاحب بہت متاثر تھے۔ وہ اسے حدیث کی اصل اور اساس قرار دیتے تھے، اسی لیے اس کی شرح عربی میں لکھی جس کا نام ''المصفّٰی'' رکھا اور ایک شرح فارسی میں سپردِ قلم کی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں زیادہ رواج فارسی کا تھا۔ یہ شرح انھوں نے ''المسویٰ'' کے نام سے موسوم کی۔

علاوہ ازیں ''شرح تراجم ابواب صحیح البخاری'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو صحیح بخاری کے تراجم ابواب کی تشریح پر مشتمل ہے۔ پھر ''حجۃ اللہ البالغہ'' تحریر فرمائی جو اسرارِ شریعت اور فلسفۂ احکام اسلامی کے موضوع پر ایک ضخیم اور مشہور کتاب ہے۔

اس کتاب کے مضامین ومحتویات کا زیادہ تر حصہ احادیث پر مبنی ہے۔ اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ شاہ صاحب علم حدیث میں بہ درجہ غایت درک رکھتے تھے۔ شاہ صاحب نے برصغیر میں علم حدیث کے سلسلے میں وہ خدمات سرانجام دیں جن کا اس سے قبل اس سرزمین کے کسی اہل علم کو کبھی خیال نہیں آیا تھا۔

تحریر کے علاوہ شاہ صاحب نے تدریس کا بھی اس ملک میں ایک وسیع سلسلہ جاری کیا۔ ان سے بے شمار شائقینِ علم نے حصول فیض کیا۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلا اور اب تک چل رہا ہے اور ان شاء اللہ چلتا رہے گا۔ اس کے آثار برصغیر کی سرزمین سے باہر نکل کر دیگر ممالک میں بھی پہنچے۔ چنانچہ مختلف ملکوں کے لاتعداد لوگ یہاں آئے اور اس ملک کے متعدد اساتذہ سے علمِ حدیث پڑھا۔

شاہ صاحب کے فرزندان گرامی

شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان کے فرزندانِ گرامی نے بھی تدریسی اور تصنیفی رنگ میں علم حدیث کی ترویج کے لیے بے پناہ تگ ودو کی۔ شاہ عبدالعزیز نے فارسی زبان میں ''بستان المحدثین'' کے نام سے محدثین کے حالات میں کتاب لکھی۔ اس سے قبل ہندوستان میں اس موضوع کی کسی زبان میں کوئی کتاب نہ تھی۔ انھوں نے اور بھی بہترین کتابیں تصنیف کیں۔ ان چاروں بھائیوں (شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی) نے تدریس کے ذریعے بھی لوگوں کو بہت فیض پہنچایا۔

نواب صدیق حسن خاں

حضرت نواب سید صدیق حسن خاں کی اختصار کے ساتھ صفحاتِ سابقہ میں قرآنی خدمات کی نشان دہی کر دی گئی ہے۔ حدیث کے متعلق انھوں نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں کتابیں تصنیف کیں۔

عربی میں بہ سلسلۂ حدیث ان کی کئی کتابیں ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

1. عون الباري لحل أدلة البخاري
2. السراج الوهاج في كشف مطالب مسلم بن الحجاج
3. فتح العلام شرح بلوغ المرام
4. الحطة في ذكر الصحاح الستة
5. الروض البسّام من ترجمة بلوغ المرام ومؤلفه الإمام
6. نزل الأبرار بالعلم المأثور في الأدعية والأذكار
7. الرحمة المهداة إلى من يريد زيادة العلم علىٰ أحاديث المشكاة
8. العبرة بما جاء في الغزو و الشهادة والهجرة

ان کتابوں کے علاوہ بھی عربی میں اس موضوع پر ان کی تصانیف ہیں۔

فارسی میں نواب صاحب کی بعض کتبِ حدیث یہ ہیں:

1. سلسلة العسجد في مشائخ السند
2. مسك الختام شرح بلوغ المرام
3. منهج الوصول إلىٰ إصطلاح أحاديث الرسول
4. موائد العوائد من عيون الأخبار والفوائد

اب حدیث کے بارے میں نواب صاحب کی اردو کتابوں میں سے چند کتابوں کے نام پڑھیے:

1. بغية القاري في ترجمة ثلاثيات البخاري
2. اتباع الحسنة في جملة أيام السنة
3. تميمة الصبي في ترجمة أحاديث النبي
4. توفيق الباري لترجمة الأدب المفرد للبخاري

5. غنية القارى في ترجمة ثلاثيات البخاري
6. محاسن الأعمال
7. ضوء الشمس في شرح حديث بني الإسلام علىٰ خمس

اردو میں حدیث کے موضوع پر ان کی اور کتابیں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے اوصاف سے نوازا تھا۔

حافظ محمد لکھوی کے رقم فرمودہ حواشی

حضرت حافظ محمد لکھوی کے فارسی اور پنجابی ترجمہ قرآن اور تفسیر محمدی کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ حافظ صاحب نے عربی میں سنن ابی داود اور مشکوٰۃ شریف کے حواشی لکھے۔ وہ پہلے پنجابی عالم تھے، جنھوں نے عربی میں یہ خدمت سرانجام دی۔ مولانا شمس الحق عظیم آبادی جب ابوداود کی شرح عون المعبود لکھ رہے تھے، انھوں نے حافظ محمد لکھوی کے حواشی ابی داود سے استفادہ کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے یہ خدمت حضرت مولانا عظیم آبادی سے پہلے انجام دی۔

ابو داود کے حواشی انھوں نے 1271ھ میں لکھے اور 1272ھ میں چھپ گئے۔ مشکوٰۃ شریف کے حواشی 1272ھ میں لکھے جو اسی سال شائع ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برصغیر کے علمی حلقوں میں حافظ صاحب کی قلمی کاوشوں کو بے حد اہمیت دی جاتی تھی۔

علماے غزنویہ کی تصنیفی اور اشاعتی خدمات

- حضرت سید عبداللہ غزنوی برصغیر کے مشہور بزرگ تھے۔ وہ 1230ھ (1815ء) میں افغانستان کے ضلع غزنی کے ایک مقام قلعہ بہادرخیل میں پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے ممتاز علما سے تعلیم حاصل کی۔ صحیح بخاری دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے پڑھی۔ نہایت متقی عالم اور اپنے ملک افغانستان

میں توحید وسنت کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ بدعات اور شرکیہ رسوم وعادات کے شدید مخالف تھے۔ افغانستان کے علمائے سوء نے اس بنیادی مسئلے پر ان کی شدید مخالفت کی اور حکومتِ وقت سے کہا کہ یہ شخص ملک میں فتنہ پھیلا رہا ہے، اسے اس کی سزا دی جائے۔ چنانچہ حکومت نے ان کو گرفتار کر کے سخت زدوکوب کیا اور ان کے تین بیٹوں مولانا سید محمد غزنوی، مولانا سید عبداللہ اور مولانا سید عبدالجبار غزنوی سمیت انھیں جیل میں ڈال دیا۔[1]

بعد ازاں شدید ترین اذیتوں کے بعد حکومت افغانستان نے حضرت سید عبداللہ غزنوی اور ان کے خاندان کے تمام افراد کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ جلاوطنی کے بعد یہ پاک باز لوگ مختلف مقامات کے چکر لگاتے ہوئے پنجاب کے شہر امرتسر پہنچے اور وہاں انھوں نے مدرسہ بھی جاری کیا جس نے مدرسہ غزنویہ کے نام سے شہرت پائی اور قرآن وحدیث کے موضوع پر خود بھی کتابیں لکھیں اور پرانی کتابیں شائع بھی کیں، جن میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہما اللہ کی تصانیف شامل ہیں۔ حدیث کے متعلق متعدد کتابیں ان حضرات کی کوشش سے پہلی مرتبہ معرضِ اشاعت میں آئیں۔ سید عبداللہ غزنوی نے 15۔ ربیع الاول 1298ھ (15۔فروری 1881ء) کو امرتسر میں وفات پائی۔

ذیل میں اس خاندان کے اصحابِ علم کی تمام تصنیفی اور اشاعتی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے، جن میں قرآنی خدمات بھی شامل ہیں۔ ان کی سب خدمات کو یک جا کر دیا گیا ہے۔

حضرت سید عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ جب افغانستان سے ہجرت کر کے وارد ہند ہوئے، ان کے بارہ بیٹے اور پندرہ بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ ہجرت

---

[1] حضرت سید عبداللہ غزنوی کے ایک بیٹے کا نام بھی عبداللہ تھا جنھیں حکومت نے باپ کے ساتھ قید کر دیا تھا۔

کے وقت ان میں سے اکثر ان کی رکاب میں یہاں پہنچے۔ بعض کو یہاں کی آب وہوا موافق نہیں آئی اور وہ اس ملک میں آنے کے بعد زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے۔ یہ سب حضرات قرآن وحدیث کے عالم اور مبلغ ومدرس تھے۔ ان کی تصنیفی اوراشاعتی خدمات کی فہرست درج ذیل ہے۔

1- **تفسیر جامع البیان مع حاشیة جامع البیان:** قرآن مجید کی مشہور تفسیر ہے اور اہل علم میں متداول ہے۔ اس کا حاشیہ مولانا عبداللہ غزنوی کے سب سے بڑے صاحب زادے مولانا محمد غزنوی نے لکھا۔ یہ تفسیر مع حاشیہ مولانا محمد غزنوی 1892ء میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تفسیر کے ساتھ مندرجہ ذیل تیرہ کتابیں پہلی دفعہ چھپیں:

- اکلیل في استنباط التنزیل: امام جلال الدین سیوطی۔
- مفحمات الأقران في مبهمات القرآن: امام جلال الدین سیوطی
- تفسیر سورة النور: امام ابن تیمیہ۔
- فوائد شتّٰی: تفسیر کے سلسلے کے مختلف علمی فوائد۔
- خاتمة الطبع المشتملة علی الفوائد المبهمة.
- فوائد شریفیة: امام ابن تیمیہ
- فتیا في مسئلة کلام اللہ تعالٰی: امام ابن تیمیہ
- کتاب الرد علی الجهمیة: امام احمد بن حنبل
- رسالة في القرآن: امام ابن تیمیہ
- قاعدة في القرآن: امام ابن تیمیہ
- الفوز الکبیر في أصول التفسیر: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
- أحادیث التوحید ورد الشرک
- أسباب الاحتراز من الشیطان

2- **حمائل غزنويه:** یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کے ترجمہ وحواشی نواب وحید الزمان خاں کے تحریر فرمودہ ہیں۔ یہ حمائل مولانا عبداللہ غزنوی کے پوتے اور مولانا محمد غزنوی کے صاحب زادے مولانا عبدالاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

3- **حمائل غزنويه:** یہ وہ حمائل غزنویہ ہے جس کا ترجمہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی کا ہے اور فوائد سلفیہ اور حواشی مولانا عبدالاول غزنوی کے ہیں۔ سب سے پہلے یہ حمائل مولانا عبدالغفور بن مولانا محمد غزنوی نے امرتسر سے شائع کی اور پھر کئی دفعہ چھپی۔ اس حمائل غزنویہ نے اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر بڑی شہرت پائی اور بہت مقبول ہوئی۔ اب نایاب ہے۔

4- **مصفّٰی مع مسویٰ:** یہ دو کتابیں ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصنیف کردہ ہیں اور موطا امام مالک کی شرحیں ہیں۔ مسویٰ فارسی میں ہے اور مصفّٰی عربی میں... یہ دونوں شرحیں ایک ساتھ پہلی مرتبہ مولانا سید محمد غزنوی نے دہلی سے شائع کیں۔

5- **كشف المغطا:** یہ موطا امام مالک کا اردو ترجمہ ہے جو نواب وحید الزمان خاں مرحوم نے کیا۔ اسے پہلی دفعہ مولانا سید محمد غزنوی نے مطبع مرتضوی دہلی سے شائع کیا۔

6- **رياض الصالحين:** یہ حضرت سید عبداللہ غزنوی کے ایما سے پہلی دفعہ لاہور سے شائع ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ مولانا ممدوح کے ایک مرید مولانا احمد الدین کوموی نے کیا۔ ''کوم'' ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) میں ایک گاؤں ہے۔ یہ ریاض الصالحین کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔

7- **مشارق الأنوار:** یہ حدیث کی مشہور کتاب ہے اور امام حسن بن محمد صغانی

لاہوری (متوفی 650ھ) کی تصنیف ہے۔ کسی زمانے میں یہ نصاب درس میں شامل تھی۔ پہلی مرتبہ مع ترجمہ تحفۃ الاخیار علمائے غزنویہ نے شائع کی۔

8- **إيقاظ همم أولي الأبصار:** یہ کتاب ردِ تقلید سے متعلق ہے۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی کے ایما پر میاں عبدالعزیز مرحوم بارایٹ لا کے والد مکرم مولوی الٰہی بخش وکیل (متوفی 17۔رمضان المبارک 1338ھ...... 5۔جون 1920ء) کے خرچ سے پہلی دفعہ لاہور میں چھپی۔

9- **ترجمة مشكوٰة المصابيح:** مشکوٰۃ کا اردو ترجمہ مولانا عبدالاول غزنوی نے کیا۔ کئی بار چھپا اور بہت مقبول ہوا۔

10- **نصرة الباري ترجمة صحيح البخاري:** مولانا عبدالاول غزنوی نے ''نصرۃ الباری'' کے نام سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ مع حواشی شروع کیا تھا۔ صرف آٹھ پارے مکمل ہوسکے۔

11- **إنعام المنعم ترجمة صحيح مسلم:** مولانا عبدالاول غزنوی نے صحیح مسلم کا اردو ترجمہ ''انعام المنعم'' کے نام سے شروع کیا تھا۔ اس کا صرف ایک پارہ چھپا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ترجمہ مکمل ہوگیا تھا یا نہیں۔

12- **اجتماع الجيوش الإسلامية على غزو المعطلات الجهمية:** یہ امام ابن قیم کی تصنیف ہے۔ پہلی مرتبہ مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

13- **رسالة الحقيقة والمجاز:** یہ امام ابن تیمیہ کا رسالہ ہے جو پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور ومولانا عبدالاول غزنوی نے شائع کیا۔

14- **جلاء الأفهام في الصلوٰة والسلام على خير الأنام:** یہ امام ابن قیم کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے مولانا عبدالقدوس

بن مولانا عبداللہ غزنوی کی کوشش سے پہلی مرتبہ مطبع القرآن والسنۃ امرتسر سے شائع کی۔

15- **شرح حديث النزول:** امام ابن تیمیہ کی تصنیف ہے۔ اسے پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے شائع کیا۔

16- **شرح خمسين:** ابن رجب حنبلی کی تصنیف ہے۔ مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کی۔

17- **تحفة العراقية في الأعمال القلبية:** امام ابن تیمیہ کی تالیف ہے۔ مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے پہلی مرتبہ امرتسر سے شائع کی۔

18- **فتوى الحموية:** اس کے مصنف بھی امام ابن تیمیہ ہیں۔ اسے بھی پہلی مرتبہ امرتسر سے مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے شائع کیا۔

19- **مجموعة البيان المبدي لشناعة القول المجدي:** علامہ سلیمان بن سحمان نجدی اس کے مصنف ہیں۔ اسے بھی مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے پہلی دفعہ امرتسر سے شائع کیا۔

20- **مجموعة التوحيد النجدية ومجموعة الحديث النجدية:** اسے بھی پہلی مرتبہ علمائے غزنویہ نے مطبع انصاری دہلی سے شائع کیا۔

21- **فتح المجيد شرح كتاب التوحيد:** یہ کتاب مولانا عبدالغفور وعبدالاول غزنوی نے پہلی مرتبہ شائع کی۔

22- **فتح الحميد شرح كتاب التوحيد:** یہ کتاب مولانا عبدالغفور و عبدالاول غزنوی کے اہتمام میں پہلی دفعہ مطبع القرآن والسنہ امرتسر سے اشاعت پذیر ہوئی۔

23- **إثبات علو الرب ومباينته عن الخلق:** یہ حضرت امام مولانا عبدالجبار

غزنوی کی تصنیف ہے اور عربی میں ہے۔

24- إثبات الإلهام والبيعة: یہ بھی مولانا عبدالجبار غزنوی کی تصنیف ہے اور اردو میں ہے۔

25- إعانة الملة الإسلامية: مولانا عبدالجبار غزنوی کا یہ رسالہ اردو میں ہے اور کفار کی ملازمت کے عدم جواز سے متعلق ہے۔

26- معارج الوصول بأن الأصول والفروع بينها الرسول: یہ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی مرحوم کا رسالہ ہے۔

27- تحشية دارمي: حضرت مولانا عبداللہ غزنوی کے لائق فرزند مولانا عبدالرحیم غزنوی نے حدیث کی مشہور کتاب سنن دارمی پر عربی میں حاشیہ لکھا تھا۔ افسوس ہے یہ حاشیہ گم ہوگیا، اس کا آخری حصہ البتہ قلمی صورت میں موجود تھا۔ اب معلوم نہیں کسی کے پاس ہے یا نہیں ہے۔

قرآن وحدیث کے سلسلے کی یہ ستائیس کتابیں ہیں جو علماے غزنویہ نے لکھیں یا ان کی کوشش سے پہلی مرتبہ شائع ہوئیں۔ یہ بہت بڑی خدمتِ دین ہے، جو ان حضرات نے اپنے دور میں کی۔

سعودی حکومت سے تعلق

یہاں یہ عرض کرنا بھی شاید مناسب ہوگا کہ غزنوی خاندان کے علما کا سعودی حکمرانوں سے بھی تعلق رہا۔ تعلق کا آغاز اس طرح ہوا کہ کسی زمانے میں حضرت سید عبداللہ غزنوی مرحوم ومغفور کے دو صاحب زادوں (مولانا عبدالرحیم غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی) کی تجارت کے سلسلے میں عرب کے بعض علاقوں میں آمدورفت تھی۔ اس ضمن میں ایک مرتبہ وہ کویت گئے تو وہاں نجد وحجاز کے والی سلطان عبدالرحمٰن اور ان کے فرزند گرامی سلطان عبدالعزیز (ابن سعود) سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں

باپ بیٹا اس وقت کویت میں مقیم تھے اور نجد پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔ غزنوی برادران سے ان باپ بیٹے نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی۔ نجد کی فتح کے بعد اپنے ہاں ان کو درس وتدریس کا سلسلہ شروع کرنے کی بھی دعوت دی، چنانچہ یہ بزرگ تقریباً پانچ سال وہاں رہے اور خاندان سعود کے بعض افراد اور اہل نجد ان سے مستفید ہوئے۔

اس اثنا میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی بعض قلمی کتابیں بھی ان کی وساطت سے برصغیر میں پہنچیں، جو خاندان غزنویہ کے علما اور یہاں کے بعض ناشروں نے شائع کیں۔ مولانا اسماعیل غزنوی اور مولانا داود غزنوی کی زندگی تک آل سعود سے ان کے تعلقات قائم رہے۔ برصغیر کے غزنوی خاندان کے اہل علم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ موجودہ سعودی حکمرانوں کے بزرگوں سے سب سے پہلے انہی کے تعلقات قائم ہوئے، جن کی بنیاد محض دینی جذبہ تھا۔

غلافِ کعبہ

غزنوی خاندان کے سلسلے کی ایک اور لائق تذکرہ بات یہ ہے کہ جلالۃ الملک عبدالعزیز (ابن سعود) کے حجاز فتح کرنے کے بعد 1346ھ (1928ء) میں حضرت سید عبداللہ غزنوی کے دو پوتوں مولانا سید محمد داود غزنوی بن حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی اور مولانا سید اسماعیل غزنوی بن حضرت مولانا سید عبدالواحد غزنوی نے امرتسر کے اعلیٰ درجے کے کشیدہ کاروں سے غلافِ کعبہ تیار کرایا اور وہ دونوں جو اس وقت نوجوان تھے، یہ غلاف مکہ مکرمہ لے کر گئے اور اسے جلالۃ الملک عبدالعزیز کو پیش کیا اور اسے کعبۃ اللہ پر چڑھایا گیا۔ یہ پہلا (اور آخری) غلاف کعبہ تھا جو بڑی خاموشی کے ساتھ برصغیر کے غزنوی خاندان کے دو نوجوان علمائے دین لے کر گئے اور اسے بیت اللہ شریف کی زینت بنایا گیا۔

مولانا اسماعیل غزنوی نے 19۔ذی الحجہ 1379ھ (13۔جون 1960ء) کو

وفات پائی اور مولانا سید محمد داود غزنوی جولائی 1895ء کے آخری ہفتے یا اگست 1895ء کے پہلے ہفتے میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے (جو قمری حساب سے 1313ھ بنتا ہے) اور 16۔دسمبر 1963ء (29۔رجب 1383ھ) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

مولانا غلام رسول مہر کا کارنامہ

گزشتہ سطور میں امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم کی تصانیف کے متعلق بتایا گیا ہے کہ برصغیر میں ان کی اشاعت کا آغاز سب سے پہلے غزنوی علمائے کرام کی کوشش سے ہوا اور ان ائمہ کرام کی بعض کتابوں کے مسودے بھی دیارِ عرب سے اسی خاندان کی وساطت سے برصغیر میں پہنچے۔ اس ضمن میں یہ بھی سنتے جایئے کہ امام ابن تیمیہ کے حالات سب سے پہلے کتابی شکل میں مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کیے اور پھر 1343ھ (1925ء) میں یہ کتاب ''سیرتِ امام ابن تیمیہ'' کے عنوان سے ''الہلال بک ایجنسی فاروق گنج لاہور'' کے مالک وبانی عبدالعزیز آفندی نے شائع کی۔ اگرچہ یہ مختصر کتاب ہے مگر حضرت امام کے حالات میں اولیں کتاب ہے۔ اس سے قبل عربی یا اردو کسی زبان میں بہ صورتِ کتاب امام ممدوح کے حالات نہیں لکھے گئے تھے، البتہ ان سے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے مضمون ضرور لکھا تھا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مجلّہ ''الندوہ'' میں بھی اس موضوع پر چند مضامین چھپے تھے۔

مولانا غلام رسول مہر 18۔ شوال 1312ھ (13۔اپریل 1895ء) کو ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے موضع پھول پور میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار برصغیر کے مشہور مصنفوں اور اونچے مرتبے کے صحافیوں میں ہوتا تھا۔ برصغیر کی ان سیاسی اور اسلامی تحریکوں کے وہ عینی شاہد تھے جن کا تعلق بیسویں صدی عیسوی سے تھا۔ جلالۃ الملک عبدالعزیز سے انھیں خاص تعلق تھا۔ فتح حجاز کے بعد ان کی دعوت پر مکہ معظّمہ گئے۔ حج بیت اللہ کیا اور مختلف اوقات میں جلالۃ الملک سے متعدد موضوعات پر

گفتگو ہوئی۔ مولانا غلام رسول مہر نے 16۔نومبر 1971ء (27۔رمضان المبارک 1392ھ) کولاہور میں وفات پائی۔

نواب وحید الزمان کی خدمات

نواب وحید الزمان خاں حیدرآبادی کے آباواجداد میں سے ایک بزرگ کسی زمانے میں افغانستان سے ہجرت کر کے ملتان آبسے تھے۔نواب صاحب کے دادا مولانا محمد ملتان کی مسند درس پر فائز تھے کہ کسی سلسلے میں لکھنؤ گئے۔ پھر وہاں کے اصحابِ علم کے اصرار پر وہیں پڑھانے لگے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام مولانا مسیح الزمان تھا۔ انھوں نے کان پور کا قصد کیا اور وہاں کاروبار میں مشغول ہوگئے۔ وہیں 1267ھ (1850ء) میں ان کے گھر بیٹا پیدا ہوا، جس کا نام وحید الزمان رکھا۔ وحید الزمان نے تعلیم کا آغاز اپنے بڑے بھائی حافظ بدیع الزمان سے کیا۔ پھر مختلف اساتذہ سے مستفید ہوئے۔ شیخ حسین بن محسن انصاری سے بھی فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ حدیث کا درس لینے کے لیے دہلی کا قصد کیا اور حضرت میاں سیّد نذیر حسین دہلوی کے بابِ علم پر دستک دی اور ان کی سندِ حدیث سے مفتخر ہوئے۔ پھر بہت سے مقامات میں گئے اور بے شمار علمائے کرام سے ملاقات کی۔ والد مکرم کے ساتھ حج بیت اللہ کیا۔

حیدرآباد (دکن) میں ملازمت شروع کی اور تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے۔ ایک وقت آیا کہ وہاں کے ہائی کورٹ کے جج مقرر کر دیے گئے۔ قرآن، حدیث، فقہ، اصول وغیرہ تمام علوم پر عبور حاصل تھا۔ 34 سال ریاست حیدرآباد میں ملازمت کی۔ 1900ء (1317ھ) میں وظیفہ پایا۔

کثیر المطالعہ اور وسیع المعلومات عالم تھے۔ ذہن نہایت رسا تھا اور حافظہ مضبوط پایا تھا۔ انھوں نے قرآن مجید کا ترجمہ کیا، جو پہلی دفعہ مولانا عبدالغفور غزنوی اور مولانا عبدالاول غزنوی نے امرتسر سے شائع کیا، جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا۔

برصغیر کے یہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے کتب حدیث موطا امام مالک، سنن ابی داود، سنن نسائی، صحیح مسلم، صحیح بخاری اور ابن ماجہ کا اردو زبان میں ترجمہ کیا۔ سلیس اور عام فہم ترجمہ۔ اس ترجمے کو بڑی پذیرائی ملی۔

نواب وحید الزمان خان نے 25۔شعبان 1338ھ (15۔مئی 1920ء) کو حیدرآباد (دکن) میں وفات پائی۔ وفات سے ایک سال پہلے اپنے والد مسیح الزمان کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے فرمایا: ''اب گھڑا حیات کے پانی سے خالی ہوگیا ہے۔'' اس کی تعبیر یہ کی کہ اب موت قریب ہے۔

مولانا محمد ابوالحسن سیالکوٹی

صوبہ پنجاب کے ایک جلیل القدر عالم مولانا محمد ابوالحسن سیالکوٹی تھے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے دورِ اول کے تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے ''فیض الباری'' کے نام سے صحیح بخاری کا اردو ترجمہ کیا اور اس کی شرح لکھی۔ یہ شرح صحیح بخاری کی سات شرحوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور وہ شرحیں یہ ہیں: فتح الباری، عمدۃ القاری، ارشاد الساری، کواکب الدراری، تیسیر القاری، منح الباری اور حاشیہ سندھی۔ فیض الباری بڑے سائز کی دس ضخیم جلدوں پر مشتمل اور ہزاروں صفحات پر محیط ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کا یہ اولیں ترجمہ اور اولیں شرح ہے جو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد اور سیالکوٹ کے جید عالم کی محنتِ شاقہ کا عدیم المثال کارنامہ ہے۔ اس ترجمہ وشرح کا اختتام 1318ھ (1901ء) کو ہوا اور اسے مولانا فقیر اللہ تاجر کتب لاہور نے شائع کیا۔ مولانا فقیر اللہ کا شمار اپنے عہد کے ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مترجم وشارح اور ناشر کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

مولانا شمس الحق عظیم آبادی

ہندوستان کے صوبہ بہار میں بے شمار اصحابِ علم نے جنم لیا اور انھوں نے بے حساب

تدریسی اور تصنیفی خدمات سرانجام دیں۔ ان میں ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی تھی۔ وہ 27۔ ذیقعدہ 1273ھ (19۔ جولائی 1857ء) کو پیدا ہوئے۔ اپنے عہد کے عالی قدر علما سے تحصیل علم کی۔ آخر محرم 1296ھ (جنوری 1879ء) میں حضرت میاں سید نذیر حسین صاحب سے سندِ حدیث لی۔ مختلف اوقات میں دو مرتبہ حضرت میاں صاحب کی خدمت میں گئے اور مجموعی طور سے ڈھائی سال ان کے حلقۂ درس میں شمولیت رہی۔

حصولِ تعلیم کے بعد خدمتِ درس بھی سرانجام دی اور تصنیف وتالیف سے بھی شغف رہا۔ حدیث سے متعلق ان کی تصانیف میں حسب ذیل کتابیں شامل ہیں۔

1...... غاية المقصود في حل سننِ أبي داود: اس نام سے حضرت ممدوح کا منصوبہ سنن ابی داود کی ایسی مفصل شرح لکھنے کا تھا جو کئی جلدوں پر مشتمل ہو۔ لیکن اس کی صرف ایک جلد مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی۔ قطعی طور سے کچھ پتا نہیں کہ یہ شرح کہاں تک لکھی گئی تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اکیس پاروں کی شرح مکمل ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے مسودے کی صرف دو جلدیں خدا بخش پٹنہ لائبریری میں محفوظ ہیں۔ باقی جلدوں کا سراغ نہیں ملتا۔

2...... عون المعبود علىٰ سنن أبي داود: یہ بھی سنن ابی داود کی شرح ہے جو چار ضخیم جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اسے غایۃ المقصود کی تلخیص قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی تصنیف کا سلسلہ سات سال میں تکمیل کو پہنچا اور یہ پہلی مرتبہ 1318ھ سے 1323ھ تک پانچ سال میں چھپی۔ اللہ نے اس کتاب کو اہل علم میں بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ برصغیر میں اپنے انداز کی یہ پہلی خدمت حدیث ہے جس کی انجام دہی کی حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی کو بارگاہِ الٰہی سے توفیق ملی۔

3...... التعليق المغني علىٰ سنن الدار قطني: حدیث کی مشہور کتاب دار قطنی کا متن مولانا عظیم آبادی نے پہلی دفعہ اپنی محققانہ تعلیقات کے ساتھ شائع کیا۔ یہ کتاب اولیں مرتبہ 1310ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے دو جلدوں میں چھپی۔ اس کا عکس پاکستان میں بھی چھپ گیا ہے۔ حضرت مولانا نے حدیث کے متعلق بہت سی خدمات سرانجام دیں، جس کی تفصیل میں نے اپنی کتاب ''دبستان حدیث'' میں بیان کی ہے۔ اس میں ان کے بعض جلیل القدر تلامذہ کے اسمائے گرامی بھی تحریر کیے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے مشورے سے کن اہل علم نے کون سی کتابیں لکھیں اور علمی حیثیت سے ان کتابوں کی کس قدر پذیرائی ہوئی۔

حضرت مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے صرف 56 سال عمر پائی اور وہ 19 ربیع الاول 1329ھ (20۔ مارچ 1911ء) کو سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کا مولد قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ (یوپی) ہے اور سالِ ولادت ہے 1282ھ (1865ء)۔ نہایت نرم مزاج، سراپا انکسار اور پیکر تواضع عالم دین تھے۔ متعدد اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ایک عرصے تک حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری کے حلقۂ درس میں رہے۔ حضرت حافظ صاحب ممدوح اپنے اس شاگرد کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے اور ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ استاذِ مکرم کے مشورے سے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کسبِ فیض کیا۔ یہ 1306ھ (1889ء) کا واقعہ ہے۔ اس وقت مولانا مبارک پوری 23 برس کے نوجوان تھے اور حضرت میاں صاحب عمر مبارک کی 86 منزلیں طے کر چکے تھے۔ حضرت میاں صاحب سے صحیح مسلم، جامع ترمذی اور سنن ابی داود مکمل پڑھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ تفسیر وحدیث اور فقہ کی بعض کتابیں ان سے پڑھیں اور سند لی۔

مولانا مبارک پوری نے مختلف مدارس میں فریضہ تدریس بھی انجام دیا اور متعدد کتابیں بھی لکھیں۔ ان کی نہایت اہم کتاب جس میں انھیں برصغیر میں اولیت حاصل ہے، جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی ہے جو چار مبسوط جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور اس پر 344 صفحات کا مقدمہ ہے، جو علاحدہ جلد میں مطبوع ہے۔ مقدمے سمیت تحفۃ الاحوذی کی پانچ جلدیں ہوئیں۔ یہ مولانا مبارک پوری کی وہ خدمت حدیث ہے، جس کی وجہ سے وہ برصغیر کے تمام اصحاب علم سے ممتاز مقام پر فائز ہیں۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے 16۔شوال 1353ھ (22۔جنوری 1935ء) کو وفات پائی۔

مولانا عبید اللہ رحمانی

مولانا عبید اللہ رحمانی مبارک پوری برصغیر کے مشہور و ممتاز عالم تھے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کے قریبی رشتے دار تھے۔ محرم 1327ھ (فروری 1909ء) میں بمقام مبارک پور (ضلع اعظم گڑھ) پیدا ہوئے۔ مختلف مدارس کے متعدد قابل اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ 1345ھ (1927ء) میں دارالحدیث رحمانیہ (دہلی) سے سندِ فراغ لی۔ اس وقت ان کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔ نہایت ذہین تھے۔ ہر امتحان میں ہمیشہ اوّل رہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد دارالحدیث رحمانیہ کے مہتمم شیخ عطاء الرحمٰن نے وہیں بہ طور مدرس ان کا تقرر کر دیا تھا اور وہ یہ فریضہ ادا کرنے لگے تھے۔ پھر لاتعداد علما و طلبا نے ان سے اخذِ علم کیا۔

تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف میں بھی حصہ ڈالا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ تحفۃ الاحوذی کے سلسلے میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کو معاون کی ضرورت پیش آئی تو انھی مولانا عبید اللہ رحمانی کو معاون مقرر کیا گیا اور کم سنی کے باوجود نہایت

اطمینان بخش طریقے سے یہ اہم خدمت انجام دی۔

حدیث کی محققانہ خدمت کے باب میں مولانا رحمانی کا ایک بہت بڑا کارنامہ مشکوٰۃ شریف کی شرح ہے، جس کا پورا نام ''مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح'' ہے۔ یہ شرح اگرچہ مکمل نہ ہوسکی، لیکن جتنی ہے، نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ پہلے یہ کتاب مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مرحوم کے اہتمام میں مکتبہ سلفیہ (لاہور) کی طرف سے لیتھو پر شائع ہوئی تھی۔ اس وقت طباعت کا یہی سلسلہ تھا۔ پھر یہ کتاب جامعہ سلفیہ (بنارس) کے اربابِ اہتمام نے نہایت خوب صورت ٹائپ پر شائع کی جو 9 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے ہندوستان، پاکستان اور عرب ممالک کے علمی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ برصغیر میں علمی اور تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس سے قبل اس خطۂ ارض میں اس انداز کی مشکوٰۃ کی شرح کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔

مولانا عبیداللہ رحمانی نے کچھ عرصہ بیمار رہ کر 85 برس کی عمر میں 6۔جنوری 1994ء (23۔رجب 1414ھ) کو اپنے وطن مبارک پور (ضلع اعظم گڑھ) میں وفات پائی۔

مولانا عبدالسلام مبارک پوری

اب مولانا عبیداللہ رحمانی مبارک پوری کے والد محترم مولانا عبدالسلام مبارک پوری کا بہت بڑا اولیں علمی کارنامہ ملاحظہ ہو۔ انھوں نے جن شیوخِ حدیث سے کسبِ علم کیا، ان میں مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری، حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی اور شیخ حسین عرب یمنی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔

مولانا عبدالسلام مبارک پوری کثیر المطالعہ بزرگ تھے اور ان کے علم کی حدیں بہت وسیع تھیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ان کا سلسلۂ تحریر بھی جاری رہتا تھا۔ علمائے کرام

کے حالات سے انھیں بالخصوص دلچسپی تھی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں 30۔اگست 1918ء کو تراجم علماے اہل حدیث کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا جو 17۔اگست 1922ء تک مسلسل چار سال جاری رہا۔ اس اثنا میں برصغیر کے 82 علمائے کرام کے حالات شائع ہوئے تھے، جن میں ایک تہائی کے قریب مولانا عبدالسلام مبارک کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھے۔

مولانا ممدوح نے برصغیر کے مختلف اخبارات میں بہت سے مضامین لکھے اور ان کے علاوہ انھوں نے ''سیرۃ البخاری'' کے نام سے جو کتاب تصنیف کی، اس کی پورے برصغیر میں مثال نہیں ملتی۔ اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں تفصیل کے ساتھ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی محدثانہ شان کے تمام پہلوؤں کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ اس کتاب کو اصحابِ علم میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس موضوع پر عربی کی بھی کوئی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

''سیرۃ البخاری'' پہلی مرتبہ 1329ھ (1911ء) میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ہندوستان میں بھی چھپی اور پاکستان کے بھی بعض اداروں نے شائع کی۔

ہندوستان کے ایک فاضل مصنف و مترجم ڈاکٹر عبدالعلیم عبدالعظیم بستوی نے مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی اس اردو تصنیف (سیرۃ البخاری) کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جو تحقیق و تخریج کے ساتھ چھپ چکا ہے اور عرب اہل علم اس سے استفادہ کررہے ہیں۔

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ حضرت امام بخاری کی اردو زبان میں سیرت لکھنے کی اولیت کا اعزاز بھی ہندوستانی عالم کو حاصل ہوا اور اس کے عربی ترجمے اور تحقیق و تخریج کی اولیت کا سہرا بھی ہندوستانی عالم کے سر بندھا۔

مولانا عبدالسلام مبارک پوری مطالعۂ کتب کے بے حد شائق تھے۔ کسی تاجر کے

پاس کوئی نئی کتاب آتی اور انھیں اس کا پتا چل جاتا تو اسے ہر قیمت پر خریدنے کی کوشش کرتے۔ کتابوں سے یہی دلچسپی اور محبت ان کی موت کا باعث بنی۔ ایک روز دہلی کی جامع مسجد کے علاقے میں دارالحدیث رحمانیہ سے ایک کتاب خریدنے کے لیے گئے، کتاب خرید کر چاندنی چوک میں گھنٹا گھر کے قریب سڑک عبور کر رہے تھے کہ اچانک ایک تیز رفتار گھوڑا گاڑی آئی، جس پر کوئی سوار اور کوچوان نہیں تھا۔ گھوڑا جو تیزی سے دوڑ رہا تھا، مولانا عبدالسلام مبارک پوری کے اوپر سے گزر گیا اور وہ اسی وقت وفات پاگئے۔ وہ تازہ خریدی ہوئی کتاب ان کے ہاتھ میں تھی، جس کا سبز رنگ کا ٹائیٹل ان کے خون سے سرخ ہوگیا تھا۔ شنید ہے کہ یہ کتاب اپنے سبز (اور خون کے سرخ) رنگ کے ٹائیٹل کے ساتھ ان کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

یہ حادثہ 24۔فروری 1924ء (18۔رجب 1342ھ) کو پیش آیا۔ إنا لله وإنا إليه راجعون.

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی

رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کی نشرواشاعت کا سلسلہ عہد نبوت سے جاری ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ لوگ اپنے علم اور حالات کے مطابق تاقیامت اس کارِ خیر میں مصروف رہیں گے۔ موجودین خادمانِ حدیث کی وسیع فہرست میں ضلع اعظم گڑھ ہی کے ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کا نامِ نامی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ممدوح 1943ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانا ہندوؤں کے آریہ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مڈل تک اپنے قصبے میں تعلیم حاصل کی۔ پھر اعظم گڑھ کے شبلی کالج میں داخلہ لیا، جس کے ساتھ ہائی کلاسوں کا بھی انتظام تھا۔ 1959ء میں انھوں نے اس کالج کے ہائی سکول میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اب وہ سکول سے فارغ

ہو چکے تھے اور کالج میں داخلے کا مرحلہ درپیش تھا۔ لیکن اس وقت ان کے باب حیات پر بہت بڑے انقلاب نے دستک دی۔ انھیں مطالعے کا شوق تھا اور یہی شوق انھیں اسلام سے متعلق کتابوں کی طرف لے گیا اور وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ مدینہ منورہ پہنچ گئے اور پھر مدینہ یونیورسٹی تک رسائی حاصل ہوگئی۔ تحصیل علم کے بعد وہیں پڑھانے لگے۔ میری ان سے پہلی ملاقات 2000ء کے فروری میں مدینہ منورہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے اپنے مکان پر حاضر ہونے کی دعوت دی تھی۔ چند اور حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ رات کا کھانا ہم نے وہیں کھایا اور دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مجھے یاد پڑتا ہے اس وقت وہ مدینہ یونیورسٹی کے ایک کالج کے پرنسپل تھے۔

اس سے آٹھ برس بعد ان سے 29۔جون 2008ء کو مدینہ منورہ ہی میں ملاقات ہوئی۔ اب بھی رات کا کھانا انھی کے ہاں کھایا، جس میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن فریوائی اور مولانا عبدالمالک مجاہد بھی شامل تھے۔ یہ دونوں حضرات اس فقیر سے ملاقات کے لیے ریاض سے تشریف لائے تھے۔ یہ تو واپس ریاض چلے گئے۔ لیکن میں رات کو ڈاکٹر اعظمی صاحب کے پاس رہا اور ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اس وقت ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی حدیث سے متعلق ایسا کام کر رہے تھے جو اب تک کسی نے نہیں کیا۔ وہ ایک ایسا مجموعہ احادیث ترتیب دے رہے تھے جو تمام ترصحیح احادیث پر مشتمل ہوگا۔ اس مجموعے کا نام انھوں نے ”الجامع الكامل في الحديث الصحيح الشامل“ تجویز فرمایا تھا۔ اور آخر جون 2001ء تک اس کی نو ضخیم جلدیں مرتب ہو چکی تھیں، جن میں ایمان، علم اور عبادات یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سے متعلق تمام کتب احادیث سے چھان بین کر کے صحیح احادیث جمع کی گئی تھیں۔ یہ سارا مواد انھوں نے مرتب صورت میں مجھے دکھایا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا

خیال یہ تھا کہ باقی جلدیں مکمل ہونے پر تمام صحیح احادیث کی تعداد بارہ سے پندرہ ہزار تک ہوگی۔ انھوں نے تقریباً 2000ء میں یہ کام شروع کیا تھا اور اندازہ یہ تھا کہ 2013ء تک مکمل ہوجائے گا۔

یہ نہایت اہم کام ہے اور وہ کام ہے جو کسی اہل علم نے اب تک نہیں کیا۔ صرف ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن اعظمی کا اس طرف دھیان گیا اور ان شاء اللہ اب قریب الاختتام ہوگا۔

میں خادمانِ حدیث کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب موصوف پر مفصل مضمون ''گلستان حدیث'' میں لکھنا چاہتا تھا، لیکن نہیں لکھ سکا۔ اب اسی قسم کی کتاب ''چمنستان حدیث'' زیر ترتیب ہے۔ ان سے متعلق مضمون ان شاء اللہ اس کتاب میں آئے گا۔

ایک خاتون کا زریں کارنامہ

امام بخاری رحمہ اللہ اور ان کی کتاب صحیح بخاری سے متعلق یہاں ایک نہایت عمدہ کام کا تذکرہ ضروری ہے جو لاہور سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون محترمہ غزالہ حامد بٹ نے کیا۔ اس کام کا تذکرہ کرنے سے پہلے تھوڑی سی تمہید۔!

لاہور کے ایک نامور اہل علم پروفیسر عبدالقیوم تھے جو 15۔جنوری 1909ء (23۔ ذوالحجہ 1326ھ) کو پیدا ہوئے۔ ان کے گھر میں علم وعمل کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ وہ تحصیل علم کی منزلیں طے کرتے ہوئے ایم اے عربی تک پہنچے اورامتحان میں اول پوزیشن حاصل کی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد وہ پروفیسر ہوگئے۔ 1947ء سے 1968ء تک لاہور کے گورنمنٹ کالج میں عربی پڑھاتے رہے۔ ملازمت سے فارغ ہوئے تو ان کی خدمات سینیئر ایڈیٹر کے طور پر پنجاب یونیورسٹی کے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ نے حاصل کرلیں۔

24۔ جولائی 1948ء کو مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نام سے پاکستان کی جماعت اہل حدیث کی تنظیم قائم ہوئی تو پروفیسر عبدالقیوم کو اس کے ناظم اعلیٰ بنایا گیا،

جب کہ اس کے صدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی کو منتخب کیا گیا تھا۔ پروفیسر صاحب ممدوح نے 8۔ستمبر 1989ء کو وفات پائی۔

وفات سے دوسرے دن پروفیسر عبدالقیوم مرحوم کے صاحب زادے میجر زبیر قیوم مجھے تعزیت کے لیے اپنی ہمشیر غزالہ حامد بٹ کے گھر لے گئے۔ دورانِ گفتگو میں محترمہ غزالہ نے بتایا کہ انھوں نے 1966ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی کیا تھا اور ''شروحِ صحیح بخاری'' کے عنوان سے ایم اے کا مقالہ لکھا تھا۔ مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں اس وقت ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ تھا اور میں نے وہ مقالہ ادارے کی طرف سے کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ مندرجات کے اعتبار سے یہ کتاب نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ مصنفہ محترمہ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ صحیح بخاری کی شروح لکھنے کا آغاز کب ہوا اور کن کن اہل علم نے یہ بابرکت خدمت سرانجام دی۔ برصغیر میں یہ منفرد نوعیت کا کام ہے جو لاہور کے قدیم اہل حدیث خاندان کی لائق احترام خاتون نے بڑی تحقیق کے ساتھ کیا۔ اس میں دو سو سے زائد شروحِ بخاری کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ میں نے اس پر مقدمہ لکھا ہے۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اصحاب علم کی مشہور شخصیت تھے، جنھوں نے درس وخطابت کا سلسلہ بھی حالات کے مطابق جاری رکھا اور تصنیف وتالیف کا بھی۔ وہ 1909ء کے پس وپیش موضع بھوجیاں (ضلع امرتسر مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے اور جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ان میں مولانا عبدالرحمٰن بھوجیانی، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی، استاذ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی اور حضرت حافظ محمد گوندلوی شامل ہیں۔ مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے بہت سے علماء وطلبا نے اخذِ علم کیا۔ ان کی تصنیفی کاوشوں میں سننِ نسائی کے حواشی

"التعليقات السلفية" کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ اللہ نے اس کتاب کو بڑی شہرت بخشی اور اہل علم کی کثیر تعداد نے اس سے استفادہ کیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، مولانا عطاء اللہ صاحب پنجاب کے پہلے عالم ہیں، جنھوں نے عربی زبان میں صحاح ستہ کی اس اہم کتاب نسائی شریف پر عربی میں تعلیقات لکھیں۔

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی نے 3۔ اکتوبر 1987ء (9۔صفر 1408ھ) کو انتقال فرمایا۔ انھوں نے پوری زندگی سادگی اور خدمتِ علم میں بسر کی۔

مولانا محمد علی جانباز

مولانا محمد علی جانباز کی تدریسی اور تصنیفی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ 1934ء میں بمقام "چک بدھو کے" ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان سمیت اس علاقے کے تمام لوگ لکھوی علمائے کرام سے متاثر تھے اور دینی مسائل سمجھنے کے لیے انھی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد علی جانباز نے تحصیل علم کا آغاز اپنے آبائی گاؤں (چک بدھو کے) میں ایک بزرگ مولانا محمد رحمانی سے کیا جو دارالحدیث رحمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔ تقسیم ہند کے وقت یہ لوگ اپنے وطن کی سکونت ترک کر کے پاکستان آئے اور ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک قریہ میں آباد ہوئے۔ اس وقت محمد علی جانباز کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ پاکستان میں انھوں نے مختلف مدارس کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، جن میں حضرت حافظ محمد گوندلوی کا اسم گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ 1958ء میں وہ جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) سے فارغ ہوئے اور پھر یہیں طلبا کو پڑھانے لگے۔ اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوئے کہ سیالکوٹ چلے گئے اور وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کر لی۔ وہاں جامعہ رحمانیہ کے نام سے دارالعلوم جاری کیا۔

مولانا محمد علی جانباز نے درس وتدریس کے ساتھ تحریری کام بھی کیا اور متعدد

کتابیں تصنیف کیں اور خود ہی شائع کیں۔ ان کی تصانیف میں ایک بہ درجہ غایت اہم تصنیف سنن ابن ماجہ کی شرح "إنجاز الحاجة" ہے۔ عربی زبان میں یہ شرح بارہ جلدوں پر مشتمل اور 7391 صفحات پر محیط ہے۔ بے شبہ اپنے انداز کی یہ عدیم المثال شرح ہے۔ سنن ابن ماجہ کی شرحیں بعض اور علمانے بھی لکھیں، لیکن ضخامت اور مندرجات میں یہ شرح سب سے فائق تر ہے جو برصغیر کے خطۂ پنجاب کے اس عالم نے لکھی۔

مولانا محمد علی جانباز نے 15۔ ذو الحجہ 1429ھ (13۔دسمبر 2008ء) کو سیالکوٹ میں وفات پائی۔ میں ان کے جنازے میں شامل تھا۔ نماز جنازہ علامہ احسان الٰہی ظہیر کے برادرِ اصغر پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی نے پڑھائی۔

مولانا محمد بن عبداللہ علوی

مولانا محمد علی جانباز سے قبل ابن ماجہ کا عربی میں حاشیہ مولانا محمد بن عبداللہ علوی پنجابی نے ''مفتاح الحاجہ'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس کی تسوید سے وہ 10۔جمادی الاولیٰ 1312ھ (10۔نومبر 1894ء) کو فارغ ہوئے تھے۔ مولانا ممدوح نہایت صالح اور متبحر عالم تھے۔ اصل میں علاقہ ہزارہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حیدرآباد (دکن) چلے گئے تھے اور عمر کا زیادہ حصہ وہیں گزارا۔ تقریباً 80 برس عمر پائی اور 1366ھ (1947ء) کے لگ بھگ وفات پائی۔ علم حدیث محدثِ شہیر شیخ حسین بن محسن انصاری یمانی سے حاصل کیا۔ ان کی تحریری کاوشوں میں مسند امام احمد کا اردو ترجمہ اور بعض دیگر علمی کام شامل ہیں۔

مولانا محمد بن عبداللہ علوی پنجابی کا یہ تحریر فرمودہ حاشیہ پہلی مرتبہ 1315ھ (1897ء) کو لکھنؤ میں سنن ابن ماجہ پر لائق احترام محشی کی زندگی میں چھپا۔ دوسری مرتبہ پاکستان میں ادارہ احیاء السنۃ النبویہ ڈی بلاک سرگودھا کی طرف سے جمادی الاولیٰ 1394ھ (جون 1974ء) میں شائع ہوا۔ تیسری مرتبہ بھی اسی ادارے نے

محرم 1398ھ (جنوری 1978ء) میں شائع کیا۔ دوسری اور تیسری طباعت کا اہتمام مرحوم ومغفور مولانا ابوالسلام محمد صدیق مدیر ادارہ احیاء السنۃ النبویہ (سرگودھا) نے کیا۔

حافظ ثناء اللہ مدنی

شیخ الحدیث مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی پاکستان کے تدریسی اور تصنیفی حلقوں کا ایک معتبر تریں نام ہے۔ پہلے وہ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی سے فیض یاب ہوئے۔ پھر مدینہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں کے گرامی مرتبت اساتذہ سے کسبِ علم کیا۔ فراغت کے بعد حافظ عبدالرحمٰن مدنی کے جامعہ رحمانیہ (لاہور) میں بہ طور شیخ الحدیث خدمات سرانجام دینے لگے۔

انھوں نے خود بھی مرکز انصار السنہ کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا ہے، جس میں فارغ التحصیل محنتی طلبا کو تدریس، تحریر اور خطابت کی تربیت دی جاتی ہے۔ فی الحال اگرچہ اس میں محدود پیمانے پر طلبا کو داخل کیا جاتا ہے، لیکن اپنے انداز کا یہ بہترین ادارہ ہے اور لاہور میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس کے تیور بتاتے ہیں کہ آگے چل کر ان شاء اللہ یہ ادارہ ترقی کرے گا اور اس کے بہت اچھے نتائج نکلیں گے۔ علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حافظ ثناء اللہ مدنی کو عمل کی نعمت سے بھی نوازا ہے۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' اور بعض دیگر رسائل وجرائد میں ان کے فتووں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔

فتاویٰ مدنیہ ثنائیہ کے نام سے ان کے فتووں کی ایک جلد کتابی صورت میں ہمارے عالم فاضل دوست قاری عبدالشکور مدنی نے اپنے اشاعتی ادارے ''دارالارشاد، 214۔ بی، سبزہ زار سکیم لاہور'' کی طرف سے شائع کر دی ہے اور دوسری جلد کی اشاعت کی تیاری کر رہے ہیں۔

یہاں دراصل عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ جناب مفتی حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی

نے ''جائزۃ الاحوذی'' کے نام سے چار جلدوں میں جامع ترمذی کی شرح لکھی۔ حافظ صاحب صوبہ پنجاب کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے عربی زبان میں یہ بہت بڑی خدمت انجام دی۔

حضرت حافظ صاحب ممدوح اب عربی میں صحیح بخاری کی شرح لکھ رہے ہیں۔ اب تک صحیح بخاری کے اردو ترجمے تو متعدد علماے کرام نے کیے اور بڑی خوب صورتی سے کیے۔ ان حضرات کا دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس طرف عنانِ توجہ مبذول فرمائی اور حدیث کی اس رفیع الشان ضخیم کتاب کا ترجمہ اور احادیث کی کچھ تشریح کر کے اردو دان طبقے کو نبی اکرم ﷺ کی ہزاروں احادیث اور آپ کے بے حد وحساب ارشادات سے آشنا کرانے کی مبارک کوشش کی اور کر رہے ہیں۔ اس عمل خیر کی اللہ ہی انھیں جزا دینے والا ہے اور ان شاء اللہ ضرور دے گا۔ لیکن عربی زبان میں اس کی مفصل شرح کا اہتمام برصغیر کے حافظ ثناء اللہ مدنی نے کیا جو صوبہ پنجاب کے شہر لاہور کے رہنے والے ہیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انھیں اس بہت بڑے کام کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ ابوالحسن سندھی کبیر

اب صوبہ سندھ کی طرف آیے۔

شیخ ابوالحسن سندھی جنھیں شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کہا جاتا ہے، قرآن وحدیث اور فقہ پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ ان بنیادی علوم کی متعدد اولیں کتابوں پر انھوں نے حواشی تحریر کیے جن سے علما وطلبا استفادہ کرتے ہیں اور حلقۂ اہل علم میں ان کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ان حواشی سے ان کی دقتِ نظر، قرآن وحدیث میں عبور ومہارت اور فقہ میں وسعتِ معلومات کا پتا چلتا ہے۔

تفسیر قرآن مجید کے سلسلے میں ان کی قابل قدر خدمت یہ ہے کہ دو مشہور تفسیروں، تفسیر

بیضاوی اور تفسیر جلالین پر حواشی تحریر فرمائے۔ قرآن مجید کی ایک مستقل تفسیر بھی لکھی۔

علم حدیث کے تمام پہلوؤں پر ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ اس علم کی انھوں نے بے پناہ خدمت کی۔ یہ خدمت تدریس کی صورت میں بھی کی اور تحریر کی صورت میں بھی۔ ان کا یہ بہت بڑا علمی کارنامہ ہے کہ صحاح ستہ پر عربی میں حواشی لکھے۔ صحیح بخاری اور ابن ماجہ کا حاشیہ مصر میں طبع ہوا۔ نسائی کا حاشیہ ہندوستان میں چھپا۔ صحیح مسلم کا حاشیہ پاکستان کے ایک ممتاز اہل حدیث عالم حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی مرحوم نے علاحدہ شکل میں شائع کیا۔ ابو داود کا غیر مطبوعہ حاشیہ سید احسان اللہ شاہ مرحوم (پیر جھنڈا) کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ترمذی کا حاشیہ غالباً مکمل نہیں ہوسکا تھا۔ مسند امام احمد پر بھی حاشیہ لکھا۔

شیخ ممدوح کو مسند امام ابوحنیفہ، ہدایہ اور فتح القدیر شرح ہدایہ پر بھی حواشی لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

ان کی بوقلموں خدمات علمیہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ بہ یک وقت بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ مفسر قرآن، شارح حدیث، فقیہ نام دار، مدرس، مبلغ، محشی، مصنف، سب کچھ تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو بے شمار کمالات سے نوازا تھا۔

شیخ ابوالحسن سندھی کے متعلق ان کے شاگرد شیخ محمد حیات سندھی لکھتے ہیں:

"کان زاهداً متورعاً کثیر الاتباع لکتاب الله وسنة رسول الله ﷺ"

یعنی شیخ ابوالحسن عابد وزاہد اور متبع کتاب وسنت تھے۔

مولانا محمد عابد سندھی رقم طراز ہیں:

"کان الشیخ عاملاً بالحدیث لا یعدل عنه إلیٰ مذهب"

کہ شیخ ابوالحسن حدیث پر عمل پیرا تھے۔ حدیث کے علاوہ کسی مذہب کو

قابلِ اعتنا نہیں قرار دیتے تھے۔

جس زمانے میں شیخ ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اس زمانے میں ان کے ایک ہم وطن شیخ ابوالطیب سندھی بھی وہاں اقامت گزیں تھے۔ وہ بھی جلیل القدر عالم اور وسیع المطالعہ بزرگ تھے۔ جامع ترمذی کے شارح اور در مختار کے محشی تھے۔ مدینہ منورہ میں ان کا غلغلہ درس بلند تھا۔ حکام وقت اور اربابِ اختیار کے درباروں میں انھیں رسائی حاصل تھی۔ مذہباً حنفی اور طریقتاً نقش بندی تھے۔ اپنے مسلک میں نہایت متشدد تھے۔ اختلافِ مسلک کی بنا پر شیخ ابوالحسن سندھی کبیر کے زبردست حریف تھے۔ ان کی وجہ سے شیخ ابوالحسن سندھی کو بارہا شدید ابتلاؤں سے گزرنا پڑا۔ شیخ محمد عابد سندھی نے اس دور کے بعض واقعات بیان کیے ہیں، جن میں دونوں کے درمیان وجہِ مخالفت کا اصل راز سامنے آجاتا ہے اور شیخ ابوالحسن کو اپنے ہم وطن وہم عصر حریف کے باعث جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں، ان کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

شیخ محمد عابد سندھی فرماتے ہیں:

شیخ ابوالحسن سندھی عامل بالحدیث تھے۔ حدیث کے علاوہ کسی مذہب کی طرف عنانِ توجہ مبذول نہیں فرماتے تھے۔ رکوع سے پہلے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے اور دو رکعتوں سے اٹھتے وقت رفع الیدین کرتے اور سینے پر ہاتھ باندھتے تھے۔ ان کے زمانے میں شیخ ابوالطیب سندھی جو حنفی المذہب تھے، اپنے مسلکِ فقہی سے قطعاً اِدھر اُدھر نہیں ہوتے تھے۔ اس قسم کے مسائل میں شیخ ابوالحسن اور شیخ ابو الطیب سندھی کے درمیان مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ شیخ ابوالحسن متنازع فیہ مسائل میں اپنے دلائل بیان کرتے تو شیخ ابوالطیب ان کے جواب میں عاجز آجاتے۔ یہ مخاصمت ان دونوں میں ہمیشہ قائم رہی۔ ایک مرتبہ ترکی کے قضاۃِ احناف میں سے ایک شخص قاضی کی حیثیت سے مدینہ منورہ آئے تو شیخ ابوالطیب ان کے پاس گئے اور شکایت کی کہ شیخ

ابوالحسن ان کے فقہی مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بعض مسائل کا ذکر کر کے کہا کہ وہ ان مسائل میں ائمہ احناف کے مخالف ہیں۔ قاضی نے اپنے طور پر شیخ ابوالحسن کے حالات اور فقہی نظریات کے بارے میں معلومات فراہم کیں تو انھیں پتا چلا کہ شیخ ابوالحسن تمام علومِ متداولہ میں درجۂ امامت پر فائز ہیں اور مختلف فنون میں ماہر کامل ہیں۔ ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ اہل مدینہ میں سے بے شمار لوگ شیخ ابوالحسن کے شاگرد ہیں اور انھیں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد قاضی مذکور شیخ ابوالحسن سے نہایت احترام کے ساتھ پیش آئے، اپنے لیے دعا کی درخواست کی اور عزت کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوئے۔

شیخ ابوالطیب سندھی نے یہ عادت بنالی تھی کہ جو قاضی بھی مدینہ منورہ آتا، اس کے پاس جاتے اور شیخ ابوالحسن کی شکایت کرتے، لیکن کوئی قاضی بھی انھیں کچھ نہ کہتا۔ ہر قاضی انھیں اپنے ہاں بلاتا اور ان سے گفتگو کرتا تو ان کے علم اور نیکی سے اس قدر متاثر ہوتا کہ احترام کے ساتھ رخصت کرتا۔ ایک مرتبہ ایک متعصب قاضی وہاں آیا۔ شیخ ابوالطیب نے حسبِ معمول اس کے پاس شیخ ابوالحسن کی شکایت کی تو اس نے شیخ کو دربار میں طلب کیا اور نہایت سخت لہجے میں حکم دیا کہ نماز میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھا کریں اور پہلی تکبیر کے سوا رفع الیدین نہ کیا کریں۔ شیخ نے جواب دیا: میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گا، وہی کروں گا، جو حدیث میں مذکور ہے اور اسی طرح نماز پڑھوں گا جس طرح خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھی یا پڑھنے کا حکم دیا۔

قاضی سخت مزاج اور متعصب تھا۔ وہ شیخ ابوالحسن سے یہ صاف جواب سننے کو تیار نہ تھا۔ اس نے غصے میں شیخ کو جیل بھیج دیا اور ایسی تنگ کوٹھڑی میں محبوس کرنے کا حکم دیا جس میں ہر وقت تاریکی چھائی رہتی تھی۔ حوائج ضروریہ کے لیے بھی ان کو باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ شیخ چھ دن اس کال کوٹھڑی میں بند رہے۔ پھر اہل مدینہ شیخ کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور کہا کہ وہ قاضی کی بات مان لیں اور جیل سے باہر آ جائیں۔ شیخ نے ان کو جواب دیا کہ جو بات صحیح حدیث سے ثابت نہیں اور رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں، میں اسے ہرگز نہیں مانوں گا، اور جو عمل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اسے کسی صورت میں نہیں چھوڑوں گا۔ یہ بات انھوں نے قسم کھا کر کہی۔

اس کے بعد اہل مدینہ پھر قاضی کے پاس گئے اور پُرزور الفاظ میں شیخ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ قاضی نے قسم اٹھا کر کہا کہ اگر میں نے ان کو نماز میں سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے دیکھ لیا تو دوبارہ جیل بھیج دوں گا۔ اہل مدینہ نے شیخ سے عرض کیا کہ ایک کپڑا لے کر پشت پر اوڑھ لیں اور اس کو دونوں طرف سے دونوں کندھوں پر ڈال لیں۔ اس کے نیچے سینے پر بھی ہاتھ باندھ لیا کریں اور رفع الیدین بھی کریں۔ شیخ نے یہ تجویز منظور فرمائی۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے بعد قاضی وفات پا گیا اور شیخ نے دوبارہ پہلے کی طرح کھلے بندوں سینے پر ہاتھ باندھنا اور رفع الیدین کرنا شروع کر دیا۔

بہرحال شیخ ابوالحسن سندھی کبیر بہت بڑے محدث اور عامل بالحدیث عالم تھے۔ ان کا سلسلۂ درسِ حدیث بہت وسیع تھا جو مسجد نبوی میں جاری تھا۔ بے شمار علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔ واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے پیچھے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ ان کی وصیت کے مطابق ان کے شاگرد رشید شیخ محمد حیات سندھی رحمہ اللہ ان کے جانشین ہوئے، جو تقلید شخصی کے خلاف اور متبع کتاب وسنت تھے۔

تذکرہ ورجال کی کتابوں میں ارضِ سندھ کے اس جلیل القدر محدث کو شیخ ابوالحسن سندھی کبیر لکھا جاتا ہے، اس لیے کہ شیخ ابوالحسن دو تھے اور دونوں سندھی تھے۔ دونوں نے مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ امتیاز کے لیے ایک کو شیخ ابوالحسن سندھی صغیر کہا جاتا ہے، ان کی تاریخ وفات 25۔ رمضان 1187ھ (10۔ دسمبر 1773ء) ہے۔ مقامِ وفات مدینہ منورہ ہے۔

دوسرے شیخ ابوالحسن بن محمد صادق سندھی کبیر ہیں، ان کا پورا نام شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی تھا، لقب نور الدین تھا۔ یہی وہ شیخ ابوالحسن سندھی کبیر ہیں، جن کے حالات قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہیں۔ ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ ایک روایت کے مطابق 1141ھ میں وفات پائی۔ ایک روایت میں 1139ھ اور ایک میں 12۔شوال 1138ھ منقول ہے۔ ایک اور روایت 1136ھ کی بھی ہے۔

مدینہ منورہ میں اس جلیل القدر عالم اور رفیع المرتبت محدث کی وفات پر انتہائی حزن وملال کا اظہار کیا گیا۔ نمازِ جنازہ میں بہت بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے تدین وتقویٰ اور بے پناہ خدمتِ حدیث سے ہر طبقہ وخیال کے لوگ انتہائی متاثر تھے۔ان کے انتقال پر عورتوں نے بھی بے حد افسوس کیا اور جنازہ اٹھا تو ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھروں کے دروازوں میں کھڑی ہوگئیں۔ دکان داروں نے افسوس میں دکانیں بند کردیں، حکومت کے اہل کاروں اور ولات وعمال نے میت کو کندھا دیا۔ میت کو مسجد نبوی میں لایا گیا اور وہیں نماز جنازہ پڑھی گئی، اور پھر اس عظیم سندھی الاصل محدث کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔ علماوطلبا اورعوام وخواص نے ان کی وفات کوایک عظیم سانحہ قرار دیا اوراس پرنہایت غم واندوہ کا اظہار کیا۔

مولانا دین محمد وفائی

صوبہ سندھ کے ایک ممتاز عالم مولانا دین محمد وفائی تھے جو وہاں کی بھٹی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ کئی نسلوں سے ان کے خاندان میں علم وعمل کا سلسلہ چلا آرہا تھا۔ مولانا دین محمد وفائی 27۔رمضان 1311ھ (3۔اپریل 1894ء) کو موضع کھتی عرف نبی آباد تعلقہ گڑھی یاسین ضلع سکھر (سندھ) میں پیدا ہوئے۔ اس عہد اور علاقے کے اہل علم سے انھوں نے خوب استفادہ کیا۔

ان کا زمانہ برصغیر میں انگریزی حکومت کا زمانہ تھا اور انگریزوں سے حصولِ

آزادی کے لیے سیاسی جماعتوں کی جدوجہد جاری تھی۔ مولانا دین محمد وفائی نے بھی حصول آزادی کی تحریکوں میں حصہ لیا اور قید ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا سید محمد داود غزنوی، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب، مولانا اسماعیل غزنوی اور دیگر بے شمار سیاسی اور دینی رہنماؤں سے ان کے تعلقات قائم تھے۔ انھوں نے تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں۔ صحیح بخاری کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ سندھی زبان میں صحیح بخاری کا یہ پہلا ترجمہ تھا۔ سندھی میں نثر اور نظم میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی ہوا۔ بعض دینی کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ لیکن ہمارے خیال میں صحیح بخاری کا ترجمہ یہی ہوا جو مولانا دین محمد وفائی نے کیا۔

مولانا موصوف نے 22۔جمادی الاخریٰ 1369ھ (11۔اپریل 1950ء) کو وفات پائی۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ ان پر تفصیلی مضمون ان شاء اللہ ''چمنستانِ حدیث'' میں لکھا جائے گا۔

سید محبّ اللہ شاہ راشدی

سید محبّ اللہ شاہ راشدی اور ان کے آباو اجداد کی تصنیفی، تدریسی اور دینی خدمات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس خاندان کے اصحاب علم کے متعلق بہت لوگوں نے بہت کچھ لکھا اور لکھا جا رہا ہے۔ لکھنے والوں میں ان سطور کے راقم کا نام بھی شامل ہے۔ اس دودمانِ عالی قدر کے بزرگ سید محبّ اللہ شاہ راشدی 29۔محرم 1340ھ (2۔اکتوبر 1921ء) کو پیدا ہوئے اور 19۔شعبان 1415ھ (21۔جنوری 1995ء) کو وفات پائی۔

سید محبّ اللہ شاہ راشدی نے (جنھیں پیر آف جھنڈا یعنی صاحب العلم کہا جاتا ہے) عربی، اردو، سندھی تینوں زبانوں میں کتابیں لکھیں۔ گیارہ کتابیں عربی زبان میں، ستائیس اردو میں اور انیس سندھی میں...... حدیث کے موضوع پر عربی میں ان کی

ایک کتاب ''التعليق النجيح علىٰ الجامع الصحيح'' ہے۔ یہ کتاب صحیح بخاری کی شرح ہے اور نو اجزا پر مشتمل ہے۔ ابھی چھپی نہیں۔ سندھی زبان میں ان کی ایک کتاب فتاویٰ راشدیہ ہے۔ یہ بھی غیر مطبوع ہے۔ صوبہ سندھ میں ان کی تبلیغی اور تصنیفی اولیات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔

سید بدیع الدین راشدی

سید بدیع الدین راشدی کا ذکر اولیاتِ قرآن کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ انھوں نے عربی، اردو، سندھی تینوں زبانوں میں لکھا۔ مجموعی اعتبار سے ان کی تصانیف کی تعداد ایک سو آٹھ تک پہنچتی ہے۔ قرآن کی طرح حدیث کے موضوع پر انھوں نے جو کچھ لکھا اور جس انداز سے لکھا، اسے ان کی اولیات میں شمار کیا جائے گا۔ وعظ وخطابت، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے سلسلے میں اس خاندان کے علمائے کرام نے جو خدمات برصغیر (بالخصوص صوبہ سندھ) میں سرانجام دیں، انھیں بے حد اہمیت حاصل ہے۔ سید بدیع الدین راشدی کی تاریخ ولادت 19۔ذی الحجہ 1343ھ (10۔ جولائی 1925ء) ہے اور تاریخِ وفات ہے 17۔شعبان 1416ھ (8۔جنوری 1996ء)۔

سندھ میں قبر پرستی اور پیر پرستی کا زور تھا۔ لوگ خلافِ شرع رسوم ورواج میں اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ معاملہ ارتکابِ شرک تک پہنچ چکا تھا۔ اس خاندان کے علما بالخصوص سید محبّ اللہ شاہ اور سید بدیع الدین راشدی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے پورے سندھ میں گھوم پھر کر وعظ وتقریر کے ذریعے لوگوں کو اللہ اور رسول (ﷺ) کے احکام پہنچائے اور ان کی اصلاحی کوششوں سے لوگ اسلام کی صراطِ مستقیم پر گام زن ہوئے۔ وعظ وتقریر کے علاوہ لوگوں نے ان کی کتابیں بھی پڑھیں جو ان کے لیے ذریعۂ ہدایت ثابت ہوئیں۔

مولانا امام الدین جونیجو

صوبہ سندھ کے موجودین اہل علم میں ایک عالم دین مولانا امام الدین جونیجو ہیں جو موضع ڈونجھ (ضلع تھرپارکر) سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مولانا حافظ عبدالستار دہلوی مرحوم ومغفور کے اردو ترجمۂ قرآن کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ حدیث کے متعلق ان کی خدمات یہ ہیں: مشکوٰۃ شریف کا سندھی زبان میں ترجمہ۔ علاوہ ازیں امام ابن تیمیہ کی اتباع الرسول، ابن سلیمان تمیمی کی اصول الدین، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید، مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی تقویۃ الایمان، مولانا ثناء اللہ امرتسری کی کلمہ طیبہ، مولانا محمد جوناگڑھی دہلوی کی نماز محمدی اور دیگر متعدد عربی اور اردو کتابوں کو سندھی زبان میں منتقل کیا۔ یہ پہلے عالم ہیں، جنھوں نے یہ خدمت سرانجام دی۔

جس ماحول میں یہ حضرات رہ رہے ہیں، اس ماحول میں دین خالص کی تبلیغ بہت مشکل کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو توفیق بخشی اور انھوں نے یہ مشکل تریں کام کیا، جس کے انتہائی اچھے نتائج نکلے۔

❀❀❀❀❀
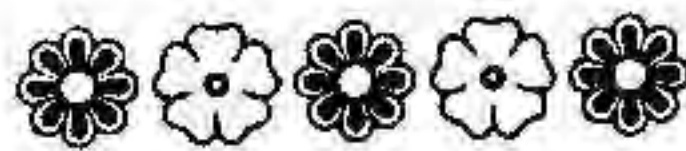
تیسرا باب

مناظرانہ سرگرمیاں

مناظرہ کے معنی کسی مسئلے میں ایک دوسرے سے بحث کرنا ہے۔ اس مسئلے کا تعلق دینیات سے ہو، سیاسیات سے ہو یا کسی اور موضوع سے۔!

مناظرے اور باہمی منازعت کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہوگیا تھا، جب انسان عالم وجود میں آیا اور عقل و خرد سے آشنا ہوا۔ دینی معاملات میں ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے عہد کے بادشاہ نمرود کی گفتگو کو مناظرے سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار برس قبل بابل کی سلطنت بڑے عروج پر تھی اور اس کی فوجی اور مالی حالت بہت مستحکم تھی۔ اس کے حکمران نمرود نے ربوبیت کا دعویٰ کیا، اپنا سونے کا مجسمہ بنا کر مندروں میں رکھوایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس کی پوجا کی جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلعتِ نبوت سے نواز کر نمرود اور اس ملک کے لوگوں کی طرف بھیجا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ تمام مخلوق کا رب صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کی عبادت کرنی چاہیے۔ یہ اعلان نمرود اور اس کی رعایا کے لیے دعوتِ توحید تھی، لیکن نمرود نے اس کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کا ذکر قرآن مجید کی سورت بقرہ کی آیت نمبر (258) میں کیا گیا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

"(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) کیا آپ نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا، جس کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہت دی تھی اور اس نے (اپنی بادشاہت کے گھمنڈ میں آکر) ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا تھا، حضرت ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو مخلوقات کو زندہ کرتا ہے اور

مارتا ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ زندہ کرنے اور مارنے والا تو میں ہوں (جسے چاہے ہلاک کردوں، جسے چاہے زندہ رکھوں) اس پر ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اگر ایسا ہی ہے تو اللہ سورج کو مشرق کی طرف سے طلوع کرتا ہے، تم مغرب کی جانب سے نکال کر دکھاؤ۔ یہ جواب سن کر وہ بادشاہ جس نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، ہکّا بکّا ہو کر رہ گیا (ابراہیم کو کوئی جواب نہ دے سکا) اور اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ ظالموں پر (فلاح) کی راہ نہیں کھولتا۔''

قرآن مجید میں اس قسم کے اور واقعات بھی ہیں، جنھیں کسی نہ کسی صورت میں مناظروں سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعض مناظروں کا ذکر بھی تاریخ کی کتابوں میں مرقوم ہے، جو انھوں نے خوارج وغیرہ سے کیے۔ ائمہ عظام کے مناظرات کا بھی سراغ ملتا ہے۔ مباہلے کا ذکر بھی سورت آل عمران کی آیت نمبر (61) میں فرمایا گیا ہے، جس کی دعوت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران سے آنے والے عیسائیوں کے ایک وفد کو دی تھی جو ساٹھ افراد پر مشتمل تھا اور اس میں چودہ ان کے سردار تھے۔

برصغیر میں مناظروں کا سلسلہ

مناظروں کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔ بے شمار اصحاب علم کے بے شمار حضرات سے مناظرے ہوئے جن میں لوگوں نے بڑی دلچسپی سے شرکت کی اور ان سے متاثر ہوئے۔ لیکن یہاں برصغیر کے چند مناظروں کا ذکر کیا جائے گا، اس لیے کہ زیرِ نظر کتاب کا تعلق برصغیر سے ہے۔ اہل حدیث علمائے کرام کے مناظرے عیسائیوں، ہندوؤں (آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں) مرزائیوں، شیعوں اور حنفیوں (بریلویوں اور دیوبندیوں) سے ہوئے۔ مناظروں سے اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے اور لوگوں کو صحیح اور غلط کا پتا چل جاتا ہے۔

برصغیر میں عیسائی پادریوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ عہدِ اکبری میں شروع ہوا۔ دورِ اکبری کے مشہور مناظروں میں مولانا سعد اللہ خاں، مولانا عبداللہ اور شیخ قطب الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد مناظرات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

شاہ عبدالعزیز کا زمانہ

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے زمانے میں مناظروں میں کافی تیزی آگئی تھی، اس لیے کہ اس زمانے میں انگریزوں کا اقتدار تقریباً پورے ملک میں قائم ہوگیا تھا اور انگریز انگلستان سے آئے تو عیسائی پادریوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئے تھے، تاکہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے لوگوں کو دائرۂ عیسائیت میں شامل کرنے کی مہم چلائی جائے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح عیسائی مذہب بھی پھیلے گا اور عیسائی حکومت بھی مضبوط ہوگی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اس صورتِ حال سے باخبر تھے اور عیسائیوں کا مقابلہ کرتے تھے۔

ذیل میں عیسائیوں سے شاہ صاحب کے چند مناظروں اور مباحثوں اور حاضر جوابی کا ذکر کیا جاتا ہے۔

❀ ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں شاہ عبدالعزیز صاحب قرآن مجید کا درس دے رہے تھے کہ ایک پادری آیا۔ اس نے کہا میرے ایک سوال کا جواب دیجیے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے پیغمبر (ﷺ) زمین میں دفن کیے گئے اور ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے آسمان پر جگہ دی۔ لہٰذا ہمارے پیغمبر کا مرتبہ مسلمانوں کے پیغمبر سے بڑا ہوا۔

شاہ صاحب نے نہایت مختصر الفاظ میں جواب دیا۔ فرمایا: اس دلیل سے ہمارے پیغمبر ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ اونچا ثابت نہیں ہوتا، اس لیے کہ جھاگ ہمیشہ

دریا کے پانی کے اوپر ہوتا ہے اور موتی زمین کی تہہ میں ہوتے ہیں۔

اس جواب میں حضرت عیسیٰ کو جھاگ اور حضرت محمد ﷺ کو موتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

❁ ایک پادری نے شاہ صاحب سے پوچھا: کیا آپ کے پیغمبر اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں؟

فرمایا: ہاں۔ اللہ کے حبیب ہیں۔

کہا: آپ کے پیغمبر نے کیا حضرت حسین کے قتل کے وقت اللہ سے فریاد نہیں کی کہ میرے نواسے کو قتل سے بچایا جائے؟ یا فریاد کی تھی، لیکن اللہ نے مانی نہیں؟

شاہ صاحب نے جواب دیا: ہمارے پیغمبر نے اللہ سے فریاد کی، لیکن اللہ نے فرمایا: تمھارے نواسے کو قوم نے شہید کیا اور شہید کا بہت بڑا مرتبہ ہے۔ مگر ہمیں اس وقت اپنا بیٹا عیسیٰ یاد آرہا ہے، جسے اس کے ماننے والوں نے صلیب پر چڑھا دیا۔

❁ ایک دفعہ ایک ہندو نے شاہ صاحب سے سوال کیا کہ اللہ ہندو ہے یا مسلمان؟

فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ ہندو ہوتا تو گائے کبھی ذبح نہ ہونے دیتا۔

دیگر علمائے کرام کے مناظرے

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے بعد بے شمار علمائے اہل حدیث کے بہت سے حضرات سے مناظرے ہوئے۔ ان میں ایک مناظر مولانا سلامت اللہ جیراج پوری تھے، جن سے مولانا شبلی نعمانی کے تحریری مناظرے ہوئے۔ مناظرے کے موضوع ترکِ تقلید، آمین بالجہر اور قراءتِ فاتحہ خلف الامام وغیرہ تھے۔ مولانا شبلی نعمانی سخت قسم کے حنفی تھے۔ ایک تقریری مناظرہ موضع ریواں (ضلع اعظم گڑھ) میں ہوا۔ ان مناظروں کے نتیجے میں خود مولانا شبلی کے خاندان میں کتاب وسنت کی اتباع کا جذبہ ابھرا۔ ایک وقت آیا کہ مولانا شبلی کے ذہن سے بھی تشدد کا عنصر بہت حد تک ختم ہو گیا۔

❁ مولانا سید امیر حسن محدث سہسوانی بھی اپنے عہد کے مشہور مناظر تھے۔ انھوں

نے ایک بہت بڑے برطانوی پادری سے مناظرہ کیا جس کا نام ''اسکاٹ'' تھا۔ مولانا کے دلائل سے پادری بہت متاثر ہوا اور اس نے ان کے تبحر علمی کا اعتراف کیا۔ مولانا سے ملاقات کے لیے اس کی سہسوان آمدورفت بھی رہی۔ وہ اپنے وطن لندن چلاگیا تھا۔ مولانا کی وفات 1291ھ (1874ء) کو ہوئی۔ پادری اسکاٹ کو ان کی وفات کا علم ہوا تو وہاں کے اخباروں میں اس نے تعزیتی مضمون لکھا، جس میں ان کے علم وفضل کی وضاحت کی۔[1]

❁ مولانا عبدالباری سہسوانی بھی مناظروں میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کا آگرہ میں پادری عمادالدین سے مناظرہ ہوا، لیکن پادری صاحب اندیشۂ فساد کا بہانہ بنا کر دوران مناظرہ میں میدان چھوڑ گئے۔

آگرہ کے علاوہ بھی متعدد مقامات کے پادریوں سے ان کی پنجہ آزمائی ہوئی، اللہ کے فضل سے ہر مناظرے میں فتح سے ہم کنار رہے۔ آگرہ میں ایک مرتبہ ایک ہندو مناظر اندرامن مراد آبادی مصنف کتاب ''تحفۃ الاسلام'' سے مناظرہ کیا۔ مولانا نے اسے مجمع عام میں شکست دی۔ یہ بھی ثابت کیا کہ یہ کتاب اس ہندو کی تصنیف نہیں ہے۔[2]

❁ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کا تذکرہ سیاسیات کے باب میں ''جماعت مجاہدین کے بعض معاونین'' کے ذیلی عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد تھے۔ جلیل المرتبت عالم، نامور محقق، ممتاز مدرس اور منجھے ہوئے مناظر تھے۔ انھوں نے مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ''سیرۃ النعمان'' کے جواب میں ''حسن البیان فیما في سیرۃ النعمان'' کے نام سے کتاب لکھی، جس میں مولانا شبلی کی تاریخی غلطیوں کی نشان دہی کی۔ ''سیرۃ النعمان''

---

[1] تذکرۃ المناظرین حصہ اول (مرتب مولانا محمد مقتدیٰ اثری عمری) (ص: 118 تا 120)
[2] تذکرۃ المناظرین حصہ اول (مرتب مولانا محمد مقتدیٰ اثری عمری) (ص: 121 تا 125)

کے دوسرے ایڈیشن میں مولانا شبلی نے ان غلطیوں کی تصحیح کی اور پھر اس قسم کے موضوع پر انھوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔

مولانا رحیم آبادی کے مناظروں کی بڑی دھوم تھی۔ انھوں نے ایک مناظرہ 16۔اگست 1903ء کو موضع ''دیوریا'' میں آریہ سماجیوں سے کیا۔ یہ تحریری مناظرہ تھا جو ایک ہفتہ جاری رہا۔ بے شمار ہندو اور مسلمان روزانہ نہایت دلچسپی سے مناظرہ سنتے تھے۔ تمام فقہی مسالک کے علمائے کرام اس مناظرے میں شامل تھے اور سب نے متفقہ طور پر مناظر مولانا رحیم آبادی کو بنایا تھا۔ مولانا رحیم آبادی اس مناظرے میں کامیاب رہے۔

جمادی الاولی 1305ھ (فروری 1888ء) کو بنگال کے شہر مرشد آباد میں مولانا رحیم آبادی کا مناظرہ ''تقلید'' کے موضوع پر علمائے احناف سے ہوا۔ مناظرہ پانچ دن جاری رہا۔ اہل حدیث اور احناف کے اس عہد کے بہت سے علما اس مناظرے میں شریک تھے۔ احناف کی طرف سے ہر روز مناظر بدلتے رہے، لیکن اہلِ حدیث کی طرف سے شروع سے آخر تک مولانا رحیم آبادی ہی مناظر رہے اور کامیابی مولانا ہی کے حصے میں آئی۔

❁ مولانا محمد جونا گڑھی (متوفی مارچ 1941ء) تقریر وتحریر، ترجمہ وتصنیف اور مباحثہ ومناظرہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی بہت سی اولیات ہیں۔ وہ اولیں عالم ہیں جنھوں نے تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ کیا اور اس ترجمے نے بے حد شہرت پائی۔ سلیس اور عام فہم ترجمہ ہے۔ بہت سے ناشرانِ کتب نے اسے شائع کیا۔

مولانا ممدوح پہلے عالم ہیں جنھوں نے امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب اعلام الموقعین کا اردو ترجمہ کیا۔ قرآن، حدیث، فقہ کے سلسلے میں اپنی نوعیت کی یہ نہایت اہم کتاب

ہے۔ اس کا ترجمہ پڑھ کر مولانا ابو الکلام آزاد نے مولانا جونا گڑھی کو خط لکھا اور ترجمے کی تحسین فرمائی۔

مولانا جونا گڑھی کی محمدیات کو بھی بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ یعنی نماز محمدی، صوم محمدی، حج محمدی، زکوٰۃ محمدی وغیرہ ان کی بہت سی تصانیف ہیں، جن کا لوگ بڑے شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔

مولانا ممدوح اپنے زمانے کے کامیاب مناظر بھی تھے۔ اللہ نے بہت سے اوصاف ان کی ذات میں جمع فرما دیے تھے۔

❁ متحدہ پنجاب کی سکھ ریاست پٹیالہ میں ایک قصبے کا نام ''پائل'' تھا۔ وہاں ایک ہندو کوٹے مل سکونت پذیر تھا۔ اس کا بیٹا اننت رام چھوٹی عمر میں اسلام کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی، اس کا دل اسلام کے قریب ہوتا گیا۔ اب اس نے ہندو پنڈتوں، سکھ مذہب کے گیانیوں، عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں سے ان کے مذاہب کے بارے میں سوال کرنا شروع کیے اور مختلف مذاہب کی کتابوں کے مطالعہ کو اپنا معمول قرار دے لیا۔ وہ چوں کہ ہندو تھا، اس لیے ہندو مذہب کا مطالعہ بے حد گہری نظر سے کیا۔ اس مذہب کے متعلق اسے ایسی ایسی باتوں کا پتا چلا جو نہایت عجیب وغریب ہیں۔ ہندو دیوتاؤں اور دیویوں کے متعلق اسے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ بے حد حیران کن تھیں اور عقل وفکر سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ شخص ستمبر 1848ء (1264ھ) کو عیدالفطر کے روز مالیر کوٹلہ میں (جو متحدہ پنجاب کی مسلمان ریاست کا دارالحکومت تھا) مسلمان ہوگیا۔ اپنے اسلام کا اعلان اس نے مسلمانوں کے مجمع عام (عیدگاہ) میں کیا اور خود ہی اپنا نام عبیداللہ رکھا۔

بہت جلد لائق اساتذہ سے اس نے تمام دینی علوم پڑھ لیے اور مولانا عبیداللہ مالیر کوٹلوی

کے نام سے شہرت پائی۔ وہ اسلام کے بہت بڑے مبلغ اور مناظر ہوئے اور بے شمار ہندو اور سکھ ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ''تحفۃ الہند'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں ہندو مذہب کے بارے میں ان کی مذہبی کتابوں کے حوالے سے عجیب وغریب قصے کہانیاں درج کی گئی ہیں۔ اردو میں اس موضوع کی یہ اوّلیں کتاب ہے، جو ہندو مذہب کے حیران کن واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مختلف مقامات سے کئی دفعہ چھپی اور جس غیر مسلم نے پڑھی، مسلمان ہوگیا۔

مولانا عبید اللہ مالیر کوٹلوی نے 1310ھ (1893ء) کو وفات پائی۔

مناظرات ومباحث کے سلسلے میں کس کس کا نام لیا جائے۔ اوّلیں مناظرین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بعد میں آنے والوں کو تو گنتی شمار میں لانا ممکن ہی نہیں۔ جماعت اہل حدیث کے بے شمار مناظرین ایک لمبی قطار میں کھڑے نظر آتے ہیں اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مناظرے میں انھیں کامیابی عطا فرمائی۔ ان میں سے اکثر مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تربیت سے میدانِ مناظرہ میں اترے۔

تمام مناظرین کے نام لکھنا بھی مشکل ہے۔ حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ایک بہت بڑا نام ہے، ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ وہ قرآن، حدیث، فقہ، اصول، فلسفہ، منطق، عربی ادبیات میں کامل مہارت رکھتے تھے اور بہت بڑے مناظر تھے۔

پھر مولانا احمد الدین گکھڑوی، مولانا نور حسین گھرجاکھی، مولانا عبداللہ معمار امرتسری، سید عبدالرحیم شاہ لکھوی، مولانا محمد صدیق لائل پوری، مولانا عبدالعزیز ملک ملتانی اور دیگر بے شمار حضرات ہیں، جنھوں نے اس سلسلے میں بڑی خدمات سرانجام دیں اور لوگوں کو ان کے مناظروں سے انتہائی فائدہ پہنچا۔ یہ لوگ اسلام کے بہت بڑے خادم تھے۔

❁ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی نے اس فن میں جن حضرات کی تربیت کی، ان میں ان کے دو بھتیجوں حافظ محمد اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بالخصوص حافظ عبدالقادر روپڑی کو اللہ نے اس فن میں بے حد مہارت سے نوازا۔ انھوں نے مرزائیوں، بریلویوں اور دیوبندیوں سے بے شمار مناظرے کیے۔ ''فتوحاتِ اہل حدیث (میزان مناظرہ)'' کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں ان کے تقریباً تمام مناظرے جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ کتاب ''محدث روپڑی اکیڈمی جامعہ اہل حدیث چوک دالگراں لاہور'' نے شائع کی ہے۔ اس اہم خدمت کی انجام دہی پر محدث روپڑی اکیڈمی کے اصحابِ انتظام مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کتابی شکل میں جمع شدہ ان مناظروں سے لوگ استفادہ کریں گے اور ارکانِ اکیڈمی کو دعائیں دیں گے۔

حافظ عبدالقادر روپڑی جس انداز سے مناظرہ کرتے اور حریف کو للکارتے تھے، وہ انتہائی اثر انگیز انداز تھا۔ اسی بنا پر لوگوں نے ان کو ''سلطان المناظرین'' کا خطاب دیا اور یہ بالکل صحیح خطاب ہے۔

مولانا عارف جاوید محمدی (مقیم کویت) کے کہنے پر مولانا احمد الدین گکھڑوی کے حالات لکھنے کی توفیق ان سطور کے راقم کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ 1431ھ کے رمضان المبارک میں مَیں نے یہ خدمت سرانجام دی۔ کتاب ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ان تمام مناظروں کا ذکر کر دیا گیا ہے جو انھوں نے مرزائیوں، عیسائیوں، شیعوں اور حنفیوں سے کیے۔ حافظ عبدالقادر روپڑی انھیں استاذ المناظرین کہا کرتے تھے، اور وہ واقعی زبردست مناظر تھے۔ ممکن ہے کوئی صاحب محنت کر کے مولانا نور حسین گھرجاکھی، مولانا عبداللہ معمار امرتسری، سید عبدالرحیم شاہ مکھوی، مولانا عبدالعزیز ملک ملتانی، مولانا محمد صدیق لائل پوری

اور دیگر حضرات کے مناظرات بھی جمع کر دیں۔ ضروری نہیں کہ اس موضوع کی ہر بات ضبطِ کتابت میں آجائے، جتنا کام ہو سکے کر دینا چاہیے۔ لا یکلف اللّٰہ نفساً إلا وسعھا

مولانا عبدالمجید سوہدروی کو اللہ جزائے خیر سے نوازے کہ انھوں نے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے مناظروں کی تفصیل، مولانا کی سوانح حیات ''سیرت ثنائی'' میں بیان کردی۔ ان کے بعد یہی خدمت مولانا فضل الرحمٰن ازہری نے اپنی کتاب ''رئیس المناظرین مولانا ثناء اللہ امرتسری'' میں انجام دی۔

ہندوستان کے عالم ومصنف مولانا محمد مقتدیٰ اثری عمری استاذ جامعہ اثریہ مئو (یوپی) بے حد شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ''تذکرۃ المناظرین'' کے خوب صورت نام سے دو جلدیں تصنیف کیں، جو ادارہ تحقیقات اسلامی جامعہ اثریہ مئو (یوپی) کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئیں۔

پہلی جلد جنوری 2002ء (شوال 1422ھ) میں چھپی۔ اس میں تقسیم ہند سے پہلے 1835ء سے 1946ء تک کے علمائے اہل حدیث پاک وہند کے مختصر سوانح حیات اور ان کے مباہلوں، مباحثوں اور مناظروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دوسری جلد میں تقسیم ہند کے بعد 1947ء سے 2001ء تک کے علمائے اہل حدیث کے مختصر سوانح حیات سمیت ان کے مناظروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ جلد ذوالحجہ 1424ھ (جنوری 2004ء) میں چھپی۔

یہ خدمت بھی مولانا محمد مقتدیٰ اثری عمری کی اولیات میں شامل ہے۔

مرزائیوں سے مباحثوں اور مناظروں کے متعلق بہت سے واقعات کی نشان دہی ہمارے دوست ڈاکٹر بہاء الدین نے ''تحریک ختم نبوت'' کی مختلف جلدوں میں کر دی ہے۔

❀❀❀❀❀
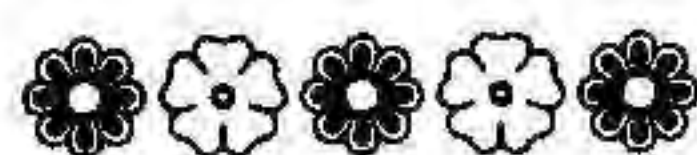
چوتھا باب

قادیانیت کے خلاف جدوجہد

برصغیر میں اپنے دورِ اقتدار میں انگریز کے ذہن فتنہ پرور نے جن فتنوں کو پیدا کیا اور ان کی پرورش کے سامان بہم پہنچائے، ان میں ایک بہت بڑا فتنہ مرزائیت کا ہے۔ اس فتنے کی سرکوبی کے لیے جو لوگ سب سے پہلے میدان میں اترے، وہ اہل حدیث علمائے کرام تھے۔ اس متن کی تشریح مختصر الفاظ میں اس طرح ہے:

مرزا غلام احمد قادیانی نے مبلغ، مجدد، مثل مسیح اور مسیح وغیرہ دعاوی کی منزلوں سے گزرتے ہوئے 1891ء (1308ھ) میں نبوت کا دعویٰ کیا۔ ظاہر ہے یہ سراسر کفر اور نبی مکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو شریعت دے کر مبعوث فرمایا، اس سے برملا انحراف تھا۔ سلسلۂ انبیا کے تاریخی واقعات ہمیں بتاتے ہیں کہ جو نبی آیا حالات کے مطابق بارگاہِ خداوندی سے نئے احکام لے کر آیا اور اس کے پیروکاروں کو اس کی امت سے تعبیر کیا گیا۔ اگرچہ بعض معاملات میں نئی امت کا پہلی امتوں سے اشتراک رہا، مگر عقیدت واطاعت کی سمتیں بہرحال بدل گئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت یہودی کہلائی اور حضرت عیسیٰ کے متبعین کو عیسائیت (یا مسیحیت) سے موسوم کیا گیا۔ پھر حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ پر ایمان لانے والوں کو ''مسلم'' کے پُراعزاز خطاب سے پکارا جانے لگا۔ ان کا اندازِ عبادت اور طریقِ اطاعت امم سابقہ سے مختلف ہے۔ پہلے احکام کے کتنے ہی حصے منسوخ کر دیے گئے۔

اسی طرح مرزائیوں نے مسلمانوں سے ایک بالکل جداگانہ اسلوبِ زیست اپنا لیا۔ ان کا نبی الگ، ان کا سلسلۂ صحابیت الگ، مسجدیں الگ، معاشرتی معاملات الگ،

رشتے ناتے الگ، غرض نبی کریم ﷺ کے اطاعت گزار مسلمانوں سے انھوں نے بالکل علاحدگی اختیار کرلی اور اپنے آپ کو ایک الگ امت قرار دے لیا، لہٰذا ان کی تکفیر ضروری ہوگئی تھی اور ان کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دینا مسلمانوں پر لازم قرار پا گیا تھا۔

اب اس سلسلے میں اہل حدیث کی اولیات ملاحظہ ہوں:

پہلا فتوائے تکفیر

سب سے پہلے حضرت مولانا محمد حسین بٹالوی میدانِ عمل میں اترے۔ وہ اولیں عالم دین ہیں جنھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی پر کفر کا فتویٰ تحریر کیا اور اسے اپنے استاذ عالی قدر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں پیش کر کے اس پر ان کے دستخط کرائے۔ بعد ازاں ہندوستان کے دور دراز مقامات میں رہنے والے دو سو معروف وممتاز علمائے کرام سے خود مل کر یا اپنے نمائندے بھیج کر اس فتوے کی عبارت انھیں سنائی۔ اس پر انھوں نے اپنے تصدیقی دستخط کیے اور مہریں ثبت فرمائیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے ساتھی اس فتوائے تکفیر پر بے حد پریشان ہوئے۔ اس پریشانی کا اظہار مرزا قادیانی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”علمائے پنجاب اور ہندوستان کی طرف سے فتنۂ تکفیر وتکذیب حد سے گزر گیا ہے اور نہ صرف علماء بلکہ فقراء اور سجادہ نشین بھی اس عاجز کو کافر اور کاذب ٹھہرانے میں مولویوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے اغوا سے ہزاروں لوگ ایسے پائے جاتے ہیں کہ وہ مجھے نصاریٰ اور ہنود سے بھی اکفر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ اس تکفیر کا بوجھ نذیر حسین دہلوی کی گردن پر ہے مگر تاہم دوسرے مولویوں کا یہ گناہ ہے کہ انھوں نے اس نازک امر تکفیر میں اپنی عقل اور اپنی تفتیش سے کام نہیں لیا بلکہ نذیر حسین کے دجالانہ فتوے کو دیکھ کر جو محمد حسین بٹالوی نے تیار کیا تھا،

بغیر تحقیق کے ایمان لے آئے۔"[1]

بانیِ تکفیر

اس فتوے کے متعلق دوسری جگہ مرزا غلام احمد لکھتے ہیں:

"مولوی محمد حسین نے یہ فتویٰ لکھا اور میاں نذیر حسین دہلوی سے کہا کہ سب سے پہلے اس پر مہر لگادے اور میرے کفر کی بابت فتویٰ دے دے اور تمام مسلمانوں میں میرا کافر ہونا شائع کر دے۔ سو اس فتوے اور میاں صاحب مذکور کی مہر سے بارہ برس پہلے یہ کتاب (براہین احمدیہ) تمام پنجاب اور ہندوستان میں شائع ہوچکی تھی اور مولوی محمد حسین جو بارہ برس بعد اول المکفرین بنے، بانی تکفیر کے وہی تھے اور اس آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں سلگانے والے میاں نذیر حسین دہلوی تھے۔"[2]

مرزا قادیانی کے ان الفاظ نے بات بالکل واضح کردی کہ ان کی "تکفیر کے بانی" مولانا محمد حسین بٹالوی تھے اور حضرت میاں صاحب "اس تکفیر کی آگ کو اپنی شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں سلگانے والے" تھے۔ یعنی حضرت میاں صاحب چوں کہ پورے ہندوستان کے علما و زعما میں اپنا ایک علمی مقام اور شہرت رکھتے تھے، اس علمی مقام اور شہرت کی وجہ سے تمام ملک میں یہ فتویٰ پھیلا اور لوگوں نے مرزا غلام احمد کو اس فتوے کی بنا پر کافر قرار دیا۔

یہ آج سے کم و بیش سوا سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت آمد و رفت کے ان ذرائع کا کوئی تصور نہ تھا جو موجودہ دور میں ہم دیکھتے ہیں۔ نہ موٹریں تھیں، نہ کاریں تھیں، نہ سڑکیں تھیں، نہ ریل گاڑیوں کا یہ تسلسل تھا۔ لوگ کچے راستوں پر پیدل یا

---

[1] انجام آتھم از مرزا غلام احمد قادیانی (ص: 45، طبع 1897ء)

[2] تحفہ گولڑویہ، از مرزا غلام احمد قادیانی (ص: 121، مطبوعہ قادیان 1914ء)

بیل گاڑیوں میں یا اونٹوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ مولانا محمد حسین بٹالوی کی ہمت اور ان کا جذبۂ خدمت دین اور داعیہ محبت رسول (ﷺ) ملاحظہ ہو کہ انھوں نے دور دراز مقامات میں خود جا کر یا اپنے نمائندے بھیج کر علمائے کرام سے اس فتوائے تکفیر پر دستخط کروائے اور ان کی مہریں لگوائیں۔ ظاہر ہے اس بھاگ دوڑ میں مولانا بٹالوی نے بہت رقم خرچ کی ہوگی۔

فتوائے تکفیر کی اشاعت

پہلی دفعہ یہ فتویٰ مولانا بٹالوی کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ اس سے تقریباً سو سال بعد یہ فتویٰ ''پاک وہند کے علمائے اسلام کا اولیں متفقہ فتویٰ'' کے نام سے حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ نے نومبر 1986ء میں دارالدعوۃ السّلفیہ لاہور کی طرف سے شائع کیا جو بڑے سائز کے 188 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس پر برصغیر کے مختلف مقامات کے دو سو علمائے کرام کے دستخط ہیں جو اپنے اپنے علاقے میں بے حد شہرت رکھتے تھے۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی کی تکفیر کے متعلق یہ فتویٰ سوا سو سال قبل کے علمائے برصغیر کی ایک معتبر ترین تاریخی دستاویز ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس وقت کون کون علمائے عظام کہاں کہاں اقامت فرما تھے۔

اس فتوے کو خوب صورت طریقے سے کتابی سائز پر دوبارہ شائع کرنا چاہیے اور اس کا مختصر نام ''اولیں فتوائے تکفیر'' ہونا چاہیے۔ اس پر مقدمہ لکھنا چاہیے، جس میں مرزائیت سے متعلق اہل حدیث کی اولیات کا تفصیل سے ذکر کیا جائے۔ کوشش کی جائے کہ فتوے پر دستخط کرنے اور مہریں لگانے والے علمائے کرام کا مختصر الفاظ میں تعارف بھی کرایا جائے۔

فتوائے تکفیر کے علاوہ مولانا بٹالوی نے براہِ راست مرزا صاحب سے مباحثہ کیا،

انھیں مباہلے کی دعوت بھی دی اور ان کی تحریروں کے جواب بھی تحریری صورت میں دیے۔ انھوں نے مرزا صاحب کے خلاف مضبوط محاذ قائم کیا اور ہر محاذ میں انھیں شکست دی۔ اس کی تفصیل اس موضوع کی کتابوں اور مولانا بٹالوی کے مجلّہ "إشاعة السنّة" میں موجود ہے۔ مولانا بٹالوی 10۔فروری 1841ء (18۔ذی الحجہ 1256ھ) کو بٹالہ (ضلع گورداس پور) میں پیدا اور 29۔جنوری 1920ء (8۔ جمادالاولیٰ 1338ھ) کو فوت ہوئے۔

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی کا الہام

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی، مصلح پنجاب اور مفسر قرآن حافظ محمد لکھوی کے فرزند گرامی قدر تھے۔ نہایت صالح اور متقی بزرگ تھے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرزا غلام احمد کے بارے میں الہام ہوا ہے کہ "إن فرعون وهامان وجنودهما كانوا خاطئين" مرزا قادیانی کذاب ومفتری اور فرعون وہامان کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مرزا صاحب نے اس پر سخت خفگی کا اظہار کیا اور مولانا ممدوح کو ہدفِ دشنام ٹھہرایا اور پیش گوئی کی کہ محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی نرینہ اولاد سے محروم رہیں گے۔ لیکن اللہ نے ان کو بیٹا عطا فرمایا، جن کا نام انھوں نے محمد علی رکھا۔ مولانا محمد علی لکھوی فرمایا کرتے تھے کہ "میں مرزا غلام احمد کی بددعا کا نتیجہ ہوں۔ میری پیدائش، میری موجودگی اور لوگوں سے میرا میل جول مرزا غلام احمد قادیانی کے کذب کا اعلان اور ثبوت ہے۔"

مولانا محی الدین عبدالرحمٰن لکھوی 1254ھ (1838ء) کو لکھوکے میں پیدا اور 15۔ ذیقعدہ 1313ھ (27۔ اپریل 1896ء) کو مدینہ منورہ (مسجد نبوی) میں فوت ہوئے اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کی قادیان میں تقریر

مرزائیت سے متعلق مولانا ثناء اللہ امرتسری کا تذکرہ بے حد ضروری ہے۔ مولانا امرتسری نے اُس عہد میں جس انداز سے مرزائیت کی تردید کی، اس کی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ تحریری، تقریری اور مناظرانہ صورت میں ہر محاذ پر انھوں نے مرزائیوں کو للکارا۔ مدعیِ نبوت مرزا غلام احمد سے لے کر نیچے درجے کے مرزائی مبلغوں تک کا انھوں نے نہایت جرات سے مقابلہ کیا۔ کبھی خیال نہیں فرمایا کہ جب وہ خود مرزا غلام احمد سے پنجہ آزمائی کر چکے ہیں تو ان چھوٹے درجے کے مبلغوں کو منہ لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ انھوں نے ہمیشہ دینی اہمیت کو پیش نگاہ رکھا اور بڑے چھوٹے ہر مرزائی کا ہر موقعے پر تعاقب کیا۔

وہ پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے برسرعام وسیع پیمانے پر مناظروں کی طرح ڈالی۔ 1902ء (1320ھ) میں مرزا صاحب نے ''اعجاز احمدی'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اس نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کو چیلنج کیا کہ وہ قادیان آئیں اور میرے الہامات کو غلط ثابت کریں۔ ہر الہام کے بدلے میں انھیں ایک سو روپے انعام دیے جائیں گے۔ اگر وہ میرے تمام الہامات کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے تو ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے انعام کے مستحق ہوں گے۔

مرزا صاحب کے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے وہ 11۔جنوری 1903ء (11۔شوال 1320ھ) کو قادیان پہنچے اور مرزا کو مقابلے میں آنے کی دعوت دی، لیکن وہ مقابلے میں نہیں آئے اور محمد احسن امروہوی کے ہاتھ رقعہ لکھ بھیجا کہ وہ قسم کھا کر اللہ سے عہد کر چکے ہیں کہ کسی سے مناظرہ نہیں کریں گے۔ یہ رقعہ پڑھ کر مولانا امرتسری نے قادیان میں تقریر کی اور مرزا صاحب کو ان کے دعوائے نبوت میں جھوٹا ثابت کیا۔ مولانا ممدوح پہلے عالم دین تھے جو مرزا صاحب کے دعوائے نبوت کے بعد

قادیان گئے اور مرزائیت کے گڑھ میں جاکر انھیں للکارا۔

اعجاز احمدی 1902ء (1320ھ) کے آخر میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے مولانا امرتسری کی فضیلت علمی کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ثناء اللہ کو مسلمانوں میں قبولیت کا مقام حاصل ہے۔

فاتح قادیان کا خطاب

مرزائیوں سے مولانا ممدوح نے مختلف مقامات پر مناظرے بھی کیے اور ان کی تردید میں کتابیں بھی لکھیں اور مرزا صاحب سے مناظرہ کرنے کے لیے قادیان بھی گئے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کو فاتح قادیان کا خطاب دیا۔ یہ خطاب اس طرح خوب صورت انداز میں لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا گیا کہ دائیں اور بائیں جانب سے بہ آسانی پڑھا جا سکتا تھا۔

جھوٹے کی سچے کی زندگی میں موت

یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اپریل 1907ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے مولانا ثناء اللہ صاحب کے لیے موت کی پیش گوئی کرتے ہوئے دعا کی کہ ''ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں مرجائے۔''

اسے مرزا غلام احمد کی پیش گوئی کہیے یا دعا اور بددعا سے تعبیر کیجیے۔ ان کی یہ ''اکلوتی'' پیش گوئی یا دعا تھی جو حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اس کے گیارہ مہینے بعد 26۔ مئی 1908ء کو مرزا صاحب کی لاہور میں موت واقع ہوگئی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری کی ولادت امرتسر میں جون 1868ء (صفر 1285ھ) کو اور وفات 15۔ مارچ 1948ء (4۔ جمادی الاولیٰ 1367ھ) کو سرگودھا میں ہوئی۔ اس طرح انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی سے چالیس برس بعد وفات پائی۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم (متوفی 6۔ نومبر 1959ء) پہلے عالم ہیں

جنھوں نے ''سیرت ثنائی'' کے نام سے مولانا امرتسری کے حالات لکھے۔ انھوں نے مولانا کے مناظرے کی حسب ذیل دس خصوصیات تحریر فرمائی ہیں۔ انھیں خود بھی ان کے بعض مناظروں میں شرکت کے مواقع ملے۔ ان خصوصیات پر ہر مناظر کو نہ صرف غور کرنا چاہیے بلکہ عمل کرنا چاہیے۔

1. مولانا امرتسری فریق ثانی کی کبھی تحقیر یا تذلیل نہ کرتے بلکہ اس کی عزت کرتے اور بہ کشادہ پیشانی پیش آتے۔
2. اعتراض یا جواب میں الفاظ ہمیشہ مختصر ہوتے مگر پُر معنی اور پُر مغز ہوتے۔
3. دقیق سے دقیق مضمون کو بھی عام فہم طریق پر بیان کرنے اور اشعار سے اس میں رنگینی پیدا کرنے کا انھیں خاص ملکہ حاصل تھا۔
4. حاضر جوابی تو گویا ان پر ختم تھی۔ ان جیسا حاضر جواب کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔
5. کسی مناظرے میں ان پر کبھی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی، بلکہ مناظرہ نہایت طمانیت سے ہنس ہنس کر کرتے۔
6. مناظرے میں ان کا انداز ہمیشہ عالمانہ رہا۔ عامیانہ انداز کبھی اختیار نہیں فرمایا۔
7. فریق ثانی کو مبحث سے کبھی باہر نہ جانے دیتے۔ اگر باہر جاتا تو گھیر گھار کر اصل مبحث پر لے آتے اور یہ فن مناظرہ کا کمال ہے۔
8. مناظرے میں اصولِ مناظرہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے اور دیگر علوم و فنون کی طرح مناظرہ علمِ مناظرہ کے اصول پر کیا کرتے تھے۔
9. شرائطِ مناظرہ میں ہمیشہ فراخ دلی سے کام لیا۔ بارہا فریق ثانی کی ناجائز شرائط کو بھی قبول کر لیا کرتے تاکہ اس بہانے سے وہ راہِ فرار اختیار نہ کرلے۔
10. میدان مناظرہ میں کبھی کوئی الزام یا جواب بلا حوالہ یا خلافِ حوالہ پیش نہیں کیا، بلکہ جو بات کی ہمیشہ دلائل سے کی۔

یہ ہیں وہ چند خصوصیات جو مولانا امرتسری کے مناظرے کا لازمی حصہ تھیں۔ دوران مناظرہ میں اگر حریف کوئی غلط لفظ بولے تو عام طور پر دوسری طرف کا مناظر فوراً بول پڑتا ہے کہ اس کو تو صحیح لفظ بولنا نہیں آتا، اصل لفظ یوں نہیں یوں ہے۔ مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ مولانا ثناء اللہ صاحب کے سامنے اگر حریف غلط لفظ بولتا تو وہ نہ اس کی تصحیح کرتے اور نہ اسے ٹوکتے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اگر غلط لفظ بولتا ہے تو بولتا رہے، ہمیں کیا ضرورت ہے اسے صحیح لفظ بتانے کی!!

مرزا قادیانی کی تکذیب میں پہلی کتاب

اپنے عہد کے ایک معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی تھے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولانا عبدالجلیل تھا جو 1857ء (1273ھ) کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے جہاد کرتے ہوئے علی گڑھ میں شہید ہوگئے تھے، اس لیے انھیں مولانا عبدالجلیل شہید کہا جاتا ہے۔ ان کے فرزند گرامی مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی کا سال ولادت 1264ھ (1848ء) ہے۔ انھیں علوم متداولہ میں مہارت حاصل تھی۔ 1892ء (1309ھ) میں انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تردید میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام "إعلاء الحق الصريح في تكذيب مثل المسيح" ہے۔ مرزا صاحب نے 1891ء (1308ھ) میں دعوائے نبوت کیا تھا۔ 44 صفحات کی یہ پہلی کتاب ہے جو اس کی تکذیب میں شائع ہوئی۔ مولانا محمد اسماعیل علی گڑھی نے 27۔شوال 1311ھ (3۔مئی 1894ء) کو رحلت فرمائی۔

مرزا قادیانی کی تردید میں قاضی صاحب کی کتابیں

قاضی محمد سلیمان منصور پوری 1867ء (1284ھ) میں ریاست پٹیالہ (مشرقی پنجاب) کے ایک قصبے منصور پور میں پیدا ہوئے اور حصولِ علم کے بعد ترقی کی منزلیں

طے کرتے ہوئے ریاست پٹیالہ کی سیشن ججی کے منصب پر پہنچے۔ انھوں نے مرزا قادیانی کے دعوائے مسیحیت ونبوت کی تردید اور ان کی تین کتابوں (فتح اسلام، توضیح المرام اور ازالہ اوہام) کے جواب میں دو کتابیں لکھیں۔ پہلی کتاب کا نام ''غایت المرام'' ہے جو 1893ء (1310ھ) میں چھپی۔ اس وقت وہ چوبیس پچیس برس کے نوجوان تھے۔ ان کی یہ کتاب متانت وسنجیدگی کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''تائید الاسلام'' ہے جو اس سے پانچ برس بعد 1898ء (1316ھ) میں طبع ہوئی۔ مرزا صاحب ان کی کسی کتاب کا جواب نہیں دے سکے۔ البتہ بقول ان کے 5۔اپریل 1893ء کو انھیں فارسی زبان میں ایک الہام ضرور ہوا۔ وہ الہام ہے ''پشت برقبلہ می کنند نماز''۔ مرزائیوں کے تذکرے کا مرتب لکھتا ہے: یہ الہام قاضی محمد سلیمان منصور پوری کے بارے میں ہوا تھا کہ وہ قبلہ کو پیٹھ دے کر نماز ادا کرتے ہیں۔ [تذکرہ صفحہ 268] سبحان اللہ! کیا الہام ہے اور کیا اس نبی کی زبان ہے!!

قاضی صاحب نے 30۔ مئی 1930ء (یکم محرم 1349ھ) کو سفر آخرت اختیار کیا۔

دہلی میں مرزا قادیانی سے پہلا مناظرہ

سہسوان، ہندوستان کے صوبہ یوپی کا ایک مشہور قصبہ ہے، جس میں بے شمار اصحابِ فضیلت پیدا ہوئے اور انھوں نے اہم علمی خدمات سرانجام دیں۔ ان جلیل القدر حضرات میں ایک عالم دین مولانا محمد بشیر سہسوانی تھے جو 1252ھ (1836ء) میں پیدا ہوئے۔ علم حدیث کی تکمیل حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے کی۔ کئی کتابوں کے مصنف اور بہت بڑے مقرر ومناظر تھے۔ کسی زمانے میں حضرت نواب صدیق حسن خاں کے پاس بھوپال چلے گئے تھے۔ 1312ھ (1894ء) میں وہ بھوپال میں تھے کہ مرزا قادیانی نے دہلی آکر اپنی مسیحیت کا ڈھنڈورا پیٹا اور مناظرے کے

لیے کہا تو اس کی اطلاع بھوپال میں مولانا محمد بشیر کو پہنچی۔ وہ دہلی تشریف لائے اور ایک مجمعے میں مرزا صاحب سے گفتگو ہوئی۔ موضوع مناظرہ حیات و ممات مسیح تھا۔ مرزا صاحب تقریری مناظرے پر رضامند نہ ہوئے تو تحریری بحث شروع ہوئی۔ مرزا صاحب نے پہلے تو حسب عادت تاویلات سے کام لیا، لیکن جب مولانا محمد بشیر کی گرفت مضبوط ہوئی اور انھوں نے حیاتِ مسیح پر دلائل دینا شروع کیے تو مرزا صاحب یہ کہہ کر میدان چھوڑ گئے کہ ان کے ''خسر'' تشریف لا رہے ہیں، ان کے استقبال کے لیے دہلی ریلوے اسٹیشن پر ان کا جانا ضروری ہے۔ مولانا نے ''خسر'' کا لفظ سنا تو قرآنِ مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ [الحج: 11]

دہلی شہر میں یہ پہلا مناظرہ تھا جو مرزا غلام احمد قادیانی سے ایک اہل حدیث عالم نے کیا۔ غالباً یہی اس شہر میں مرزا صاحب سے آخری مناظرہ تھا۔

اس مناظرے کی تفصیل، اس کا پورا تحریری مواد اور مرزا صاحب کا اس سے فرار سب کتابی شکل میں شائع ہوگیا تھا۔ اس کتاب کا نام ''الحق الصريح في إثبات حيات المسيح'' تھا۔ کتاب مطبع انصاری دہلی میں چھپی تھی۔

مولانا محمد بشیر سہسوانی نے 29۔جون 1908ء (29۔جمادی الاولیٰ 1326ھ) کو دہلی میں وفات پائی اور اپنے استاذِ عالی مرتبت حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے جوار میں قبرستان شیدی پورہ میں دفن کیے گئے۔

مولانا سیالکوٹی کی 17 کتابیں

حضرت مولانا محمد ابراہیم میر۔سیالکوٹی جماعت اہل حدیث کے ممتاز ترین عالم تھے۔ تقریباً 84 کتابوں کے مصنف، مفسر قرآن، زوردار مقرر اور بہت بڑے محقق، وسیع المطالعہ اور حاضر جواب مناظر۔ مرزائیت کے خلاف انھوں نے 17 کتابیں تصنیف

فرمائیں، جن میں ایک کتاب کا نام ''شہادۃ القرآن'' ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔

مولانا سیالکوٹی پہلے عالم دین ہیں جنھوں نے ایک ضخیم کتاب ''شہادۃ القرآن'' میں قرآن مجید کی روشنی میں مرزائیت پر بحث کی۔ یہ کتاب کئی دفعہ چھپی اور بہت پڑھی گئی۔

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اپریل 1874ء (صفر 1291ھ) کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور 12۔جنوری 1956ء (28۔جمادی الاولیٰ 1375ھ) کو ان کی وفات ہوئی۔

مباہلہ اور اس کا نتیجہ

مولانا عبدالحق غزنوی رحمہ اللہ ایک بلند پایہ صوفی مشرب اہل حدیث عالم تھے۔ اپنے زہد وتقویٰ، پاکیزگیِ نفس اور عبادت وسادگی کے سبب صوفی عبدالحق کے لقب سے معروف تھے۔ مولانا عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ کے ساتھ غزنی سے ترکِ وطن کر کے امرتسر آئے تھے۔ اسلام کے دفاع اور نئے نئے فتنوں سے اُس کی حفاظت کا شدید جذبہ رکھتے تھے۔ مرزا قادنی کے بے سروپا دعاویٰ و دجل اور فریب پر مبنی خیالات کے ظہور کے ساتھ ہی انھوں نے اشتہارات وبیانات کے ذریعے ان کی حقیقت سے پردہ اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ فریقین میں مقابلہ ہوتا رہا، بات بڑھتے بڑھتے مباہلے تک جا پہنچی۔ مباہلے کے لیے جو طریق کار مقرر ہوا وہ مولانا عبدالحق غزنوی کے الفاظ میں یہ تھا:

''مقام عیدگاہ (امرتسر) میں مباہلہ اس طریق پر بہ ایں الفاظ ہوگا:

''میں یعنی عبدالحق تین بار باآواز بلند کہوں گا: یا اللہ! میں مرزا کو ضال، مضل، ملحد، دجال، کذاب، مفتری، محرفِ کلام اللہ واحادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتا ہوں۔ اگر میں اس بات میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر وہ لعنت کر جو کسی کافر پر تو نے آج تک نہ کی ہو۔ مرزا تین بار باآواز بلند کہے گا: یا اللہ اگر میں

ضال ومضل وملحد ودجال وکذاب ومفتری ومحرفِ کتاب اللہ واحادیثِ رسول اللہ ﷺ ہوں تو مجھ پر وہ لعنت کر جو کسی کافر پر آج تک تو نے نہ کی ہو۔

''بعدہ روبقبلہ ہو کر دیر تک ابتہال اور عاجزی سے دعا کریں گے کہ یا اللہ جھوٹے کو شرمندہ اور رسوا کر اور سب حاضرینِ مجلس آمین کہیں گے۔''[1]

مذکورہ اشتہار کے مطابق 10۔ ذی قعدہ 1310ھ (25۔ مئی 1893ء) کو عیدگاہ امرتسر میں مباہلہ ہوا اور فریقین امن وامان سے واپس چلے گئے۔ اس مباہلے کے نتیجے میں مرزا غلام احمد 26۔ مئی 1908ء (25۔ ربیع الثانی 1326ھ) کو لاہور میں ہیضے کی بیماری سے مباہلہ کرنے والے مدمقابل (مولانا عبدالحق غزنوی رحمہ اللہ) کی زندگی ہی میں بیت الخلا میں مرگیا اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ اس کے مرنے کے بعد لاہور کی احمدیہ بلڈنگس سے اس کی لاش کو قادیان لے جانے کے لیے جب لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو اس پر اینٹ، پتھر، گندگی اور غلاظت کی ایسی بارش ہوئی کہ تاریخ میں کسی بدترین کافر کے لیے بھی ایسی ذلت ورسوائی کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس مولانا عبدالحق غزنوی رحمہ اللہ مرزا صاحب کی وفات کے بعد پورے نو برس زندہ رہے۔ ان کا انتقال 23۔ رجب 1335ھ (16۔ مئی 1917ء) کو ہوا اور نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ دفن کیے گئے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا عبدالحق غزنوی رحمہ اللہ پوری امت میں تنہا وہ شخص ہیں جن کے ساتھ مرزا صاحب کا مباہلہ ہوا۔ ان کے علاوہ متعدد علما کے ساتھ مباہلے کی بات چیت اور اشتہار بازی تو ہوئی مگر عملاً کسی کے ساتھ مباہلہ نہیں ہوا۔ گویا مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ مباہلے اور پھر اس میں کامیابی کی سعادت پوری امت میں صرف ایک اہل حدیث عالم دین مولانا عبدالحق غزنوی کو حاصل ہوئی۔

[1] تاریخ مرزا (ص: 47، مطبوعہ المکتبۃ السلفیہ لاہور) بحوالہ اشتہار مولانا عبدالحق غزنوی، 8۔ ذی قعدہ 1310ھ۔

مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا اولیں مطالبہ

مولانا محمد حنیف ندوی پہلے اہل علم اور صاحب قلم ہیں، جنھوں نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' (لاہور) میں حکومت پاکستان سے مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا، بلکہ مرزائیوں سے اپیل کی کہ اب انگریزی حکومت کا دور ختم ہوگیا ہے، وہ اس مسئلے پر غور کریں کہ پاکستان میں جو آئین بنے گا، اس میں ان کی جگہ کہاں ہوگی اور نئے نبی کی نئی امت کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس لیے انھیں حکومت سے خود ہی مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ انھیں اقلیت قرار دے کر دوسری اقلیتوں کی طرح ان کے تحفظ کی ذمہ داری لے۔ مولانا ندوی کے اس موضوع سے متعلق مضامین ''الاعتصام'' کے اجرا کے ابتدائی دور یعنی 1949ء سے 1951ء تک کے بہت سے شماروں میں چھپے۔ بعد ازاں 1952ء میں ''مرزائیت نئے زاویوں سے'' کے نام سے کتابی شکل میں معرضِ اشاعت میں آئے۔ پھر یہ کتاب نئے انداز میں اپریل 2001ء میں طارق اکیڈمی فیصل آباد کی طرف سے شائع ہوئی۔ میں نے اس کتاب پر مقدمہ لکھا۔

علمائے کرام مرزائیوں کو کافر تو قرار دیتے تھے، لیکن ان کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ پہلی دفعہ مولانا محمد حنیف ندوی نے ''الاعتصام'' کے صفحات میں کیا۔

مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''ہماری رائے میں خود قادیانیوں کو اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مسلمانوں کی ایک شاخ ہیں۔ ان کے لیے یہی مناسب ہے کہ یہ ایک اقلیتی قوم کی حیثیت سے پاکستان میں رہیں۔ اقلیت کی یہ رعایت بھی ان کے لیے بس ایک ناگزیر رعایت ہے جو حالات کی مجبوریوں سے دی گئی ہے، ورنہ خالص اسلامی طرز عمل تو وہی ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین کے مقابلے میں اختیار کیا۔ یہاں کی ریاست چوں کہ مشترکہ

جدوجہد کے اصول پر منصۂ شہود پر آئی ہے، اس لیے قانون مجبور ہے کہ انھیں شہریت کے تمام حقوق بخشے اور ان کی حفاظت کرے۔"[1]

"القادیانیہ" علامہ احسان الٰہی ظہیر کی عربی تصنیف

علامہ احسان الٰہی ظہیر جماعت اہل حدیث کے نامور مقرر اور ممتاز مصنف تھے۔ انھوں نے "القادیانیہ" کے نام سے عربی میں کتاب لکھی جو عرب ممالک میں بہت پھیلی اور بڑے بڑے عرب اہل علم کے مطالعہ میں آئی۔ اس کے فارسی، اردو اور انگلش ترجمے چھپ کر عام ہوئے۔ علامہ موصوف کی مرزائیت کی تردید میں یہ بہت بڑی خدمت ہے اور مرزائیت کے خلاف پاکستان کے ایک اہل حدیث عالم کی یہ اولیں عربی کتاب ہے۔ علامہ مرحوم لاہور میں اپنے نو ساتھیوں سمیت 23۔ مارچ 1987ء (22۔ رجب 1407ھ) کو بم دھماکے میں شہید ہوئے۔ انھیں علاج کے لیے ریاض (سعودی عرب) لے جایا گیا تھا، لیکن جاں بر نہ ہو سکے۔ وہیں وفات پائی اور قبرستان جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں دفن کیے گئے۔

ہمارے دوست ڈاکٹر بہاء الدین (محمد سلیمان اظہر) نے بارہ تیرہ ضخیم جلدوں میں "تحریک ختم نبوت" کے نام سے کتاب لکھی، جس میں مرزائیت کے سلسلے کا بہت سا ضروری مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ اس اہم خدمت پر اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

مرزائیت کے بارے میں اہل حدیث کی ان تحریری و تصنیفی خدمات کا تذکرہ قلم روک روک کر نہایت اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے اور بات اہل حدیث کی اولیات تک محدود رکھی گئی ہے۔ یعنی اس موضوع کی ان اولیں تحریروں کا ذکر کیا گیا ہے جو اردو یا عربی میں کتابی صورت میں چھپیں۔

---

[1] مرزائیت نئے زاویوں سے (ص: 127)

1953ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت

1953ء میں پاکستان کی تمام دینی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے مشترکہ طور پر تحریک تحفظ ختم نبوت شروع کی گئی تھی اور اس سلسلے میں ایک مجلس عمل بنائی گئی تھی، جس کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد داود غزنوی کو بنایا گیا تھا۔ اس تحریک میں اہل حدیث کے بہت سے علمائے کرام گرفتار ہوئے اور کئی کئی مہینے ملک کی مختلف جیلوں میں رہے۔ ان میں مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد یوسف کلکتوی، مولانا معین الدین لکھوی، مولانا عبداللہ گورداس پوری، مولانا عبیداللہ احرار، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف، مولانا محمد حسین شیخوپوری، مولانا عبدالغفار حسن، حافظ عبدالقادر روپڑی، حافظ محمد ابراہیم کمیرپوری، مولانا احمد دین گکھڑوی، اور دیگر بے شمار حضرات شامل تھے۔ تنہا چک نمبر 36 گ ب (ضلع فیصل آباد) کے تقریباً سو آدمی بہ یک وقت گرفتار ہوئے جن میں شیخ الحدیث حافظ احمد اللہ بڈھیمالوی بھی شامل تھے۔ صرف ایک چھوٹے سے گاؤں سے اتنے لوگوں کی بہ یک وقت گرفتاری ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ یہ لوگ کئی مہینے فیصل آباد کی جیل میں قید رہے۔ ہمارے گاؤں چک نمبر 53 گ ب منصور پور (ضلع فیصل آباد) کے بھی بہت سے افراد کو گرفتار کیا گیا تھا۔

اس تحریک کے بعد حکومت نے جسٹس محمد منیر اور جسٹس محمد رستم کیانی پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن بنایا تھا۔ اس کمیشن میں مجلس عمل کی طرف سے بہ طور وکیل بحث کیے لیے مولانا سید محمد داود غزنوی کو مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا غزنوی نے یہ فریضہ نہایت حسن وخوبی کے ساتھ سرانجام دیا۔ مولانا غزنوی کی گفتگو سے متاثر ہوکر ایک دفعہ جسٹس کیانی نے مولانا سے کہا تھا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں آپ کو وکالت کا لائیسنس دے دیتا۔

1974ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت

1974ء کی تحریک تحفظِ ختم نبوت میں بھی لاتعداد اہل حدیث حضرات کو گرفتار کر کے ملک کی مختلف جیلوں میں قید کیا گیا۔ اس فہرست میں مولانا معین الدین لکھوی، مولانا عبداللہ امجد چھتوی اور ان کے علاوہ بہت سے اہل حدیث حضرات کے نام شامل ہیں۔ 1974ء میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کے سلسلے میں جو مواد پاکستان کی قومی اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا، اس کی جمع وترتیب میں بھی اہل حدیث علمائے کرام پیش پیش تھے، ان میں مولانا عبدالرحیم اشرف، حافظ محمد ابرہیم کمیرپوری اور ان کے ساتھیوں نے بے حد محنت کی۔

یہ ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے، جس میں اہل حدیث کی خدمات کو تفصیل سے اجاگر کرنا چاہیے۔ یہاں تو چند اشارے ہی کیے جاسکتے ہیں، وہ بھی انتہائی اختصار کے ساتھ اور وہ کردیے گئے ہیں۔

اس موضوع کے سلسلے میں ہم کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتے اور نہ یہ ہمارا منصب ہے۔ ہمارا مقصد مثبت انداز میں صرف جماعت اہل حدیث کی تگ ودو کی نشان دہی کرنا ہے۔ کسی سے تقابل یا جھگڑا ہرگز ہمارا نقطہ نظر نہیں اور ہماری یہ عادت بھی نہیں ہے۔

❀❀❀❀❀
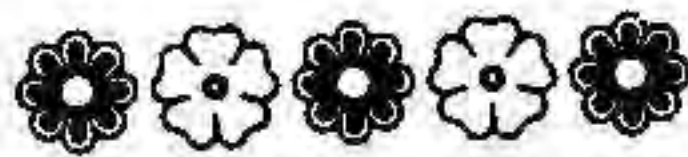
پانچواں باب

آزادیِ برصغیر کے لیے تگ وتاز

اب آیئے برصغیر میں اہل حدیث کی سیاسیات سے متعلق اوّلیّات کی طرف!

تیرھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی کا زمانہ برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کے لیے بے حد تکلیف اور اذیت کا زمانہ تھا۔ جو لوگ مسلمانوں کی اس زبوں حالی اور ابتری سے بہت زیادہ متاثر اور پریشان ہوئے، ان میں حضرت سید احمد شہید بریلوی، مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور ان کے رفقائے کرام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ پاک باز لوگ اجتماعی طور سے میدانِ عمل میں نکلے اور پورے ملک میں پھیل گئے۔ انھوں نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا، ملک کے دیہات اور قصبات وبلاد میں گئے، لوگوں کی خاص قسم کی تربیت کی اور منظّم طریقے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

تحریک مجاہدین کا مقصد

ان کی ایک باقاعدہ تحریک تھی، جس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ مسلمان بدعات کو ترک کردیں، ہندوانہ رسوم ورواج سے جو باہمی اختلاط کی وجہ سے ان میں گھر کر چکی تھیں، کنارہ کش ہوجائیں، امورِ شرک سے دست بردار ہو جائیں اور اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزاریں۔ نماز روزے کی پابندی کریں اور عقیدہ وعمل میں کتاب وسنت کے احکام کو مشعلِ راہ بنائیں۔

دوسرا مقصد اس ملک سے انگریزی اثر و رسوخ کو ختم کرنا اور اس کے لیے باقاعدہ جہاد کرنا تھا۔ یہ دونوں مقاصد نہایت اہم اور بنیادی تھے۔ چنانچہ اس کے لیے

انھوں نے پوری جدوجہد کی اور برصغیر میں ایک تہلکہ بپا کر دیا۔

یہ اس ملک میں احیاے دین کی پہلی باقاعدہ تحریک تھی، جس کا اساسی نقطۂ نظر خالص کتاب وسنت کی ترویج واشاعت تھا اور جس کے ذریعے مسلمانوں کو دعوتِ جہاد دے کر غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ان لوگوں نے ملک کو خیر باد کہا اور آرام وآسائش کی زندگی ترک کر کے اپنے آپ کو بے پناہ تکلیفوں اور مصیبتوں کے حوالے کیا۔ نہایت مسرت کے ساتھ جذبۂ جہاد سے سرشار ہو کر، ان نفوسِ قدسیہ نے اپنے گھروں سے کوچ کیا اور سرحد پار کے علاقے کو جو انگریزوں کی دسترس اور غیر مسلموں کی عمل داری سے باہر تھا، اپنا مرکز قرار دے لیا۔

پہلا قافلہ جو پانچ اور چھ سو کے درمیان غازیوں پر مشتمل تھا، 7۔ جمادی الاخریٰ 1241ھ (17۔ جنوری 1826ء) کو امیر المجاہدین سید احمد شہید کی قیادت میں روانہ ہوا۔ ان کے پاس کل پانچ ہزار روپے کی رقم تھی، جسے زادِ راہ کہنا چاہیے۔ پنجاب میں سکھوں کی حکومت کی وجہ سے گزرنا مشکل تھا، لہٰذا یہ لوگ راجستھان سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے، وہاں سے قندھار اور پھر کابل گئے۔ کابل سے روانہ ہو کر ہندوستان کی شمال مغربی سرحد میں داخل ہوئے اور آزاد قبائل کو اپنا مسکن ٹھہرایا۔ اس کے بعد برصغیر کے مختلف مقامات سے بکثرت مجاہدین وہاں پہنچنا شروع ہو گئے۔

مجاہدین کے اس مختصر سے قافلے نے جیسے ہی آزاد مرکز میں پڑاؤ ڈالا، سکھوں کی فوج مقابلے کو نکل آئی اور لڑائی کا چیلنج دیا۔ یہ ہنگامی حالات تھے۔ چنانچہ نظم وضبط قائم رکھنے اور مفتوحہ علاقوں کا انتظام کرنے کے لیے ایک باقاعدہ نظامِ حکومت کی ضرورت محسوس کی گئی، اس لیے 12۔ جمادی الاخریٰ 1242ھ (10۔ جنوری 1827ء) کو ایک عارضی حکومت قائم کر دی گئی۔ سید احمد شہید اس حکومت کے امیر مقرر ہوئے۔ سید صاحب کے ہندوستانی رفقا کے علاوہ مقامی علاقے کے پٹھانوں نے بھی سید صاحب

کی بیعت کی اور ان کی قیادت میں شریکِ جہاد ہونے کا اعلان کیا۔

سید صاحب کے رفقاے کرام کی اکثریت علماے دین پر مشتمل تھی اور سلسلۂ جہاد کی زمامِ قیادت انہی کے ہاتھ میں تھی۔ علما میں مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولانا کرامت علی جون پوری، مولانا سید اولاد حسن قنوجی، مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا سید محمد علی رام پوری؛ غرض بہت سے اہلِ علم اور اصحابِ فضل وکمال اس جماعت میں شامل تھے، جو محض اعلاے کلمۃ اللہ اور ملک سے انگریز کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے میدان میں اترے تھے۔ لیکن حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ سکھ ان کے مقابلے میں نکل آئے اور ان سے مسلسل کئی شدید جنگیں ہوئیں۔ آخری مقابلہ بالاکوٹ کے میدان میں ہوا، جس میں 24۔ ذی قعدہ 1246ھ (6۔ مئی 1831ء) کو سید احمد بریلوی، مولانا محمد اسماعیل دہلوی سمیت سیکڑوں حضرات مرتبۂ شہادت کو پہنچے۔

بہرکیف مقابلہ کسی سے ہو، سکھوں سے ہو یا انگریزوں سے، اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دونوں فریق مسلمانوں کے دشمن تھے اور دونوں کا مطمحِ نظر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ معرکۂ بالاکوٹ کے بعد مجاہدین براہ راست انگریز کے خلاف صف آرا ہوئے۔

مجاہدین کی یہ تحریک خالص اسلامی اور باقاعدہ تحریک تھی، جو تقریباً سوا سو سال (1947ء) تک انگریزی حکومت کے خلاف معرکہ آرا رہی اور بالآخر اس حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ

تحریکِ مجاہدین کی بنیاد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا وہ فتویٰ تھا، جو انھوں نے انگریزوں کے خلاف جاری فرمایا تھا۔ فتویٰ فارسی زبان میں جاری کیا گیا تھا۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

”یہاں رؤسائے نصاریٰ (عیسائی حکام) کا حکم بے جھجک جاری ہے اور ان کا حکم جاری اور نافذ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ملک داری، انتظاماتِ رعیت، خراج وباج، عشرومال گزاری، اموالِ تجارت، ڈاکوؤں اور چوروں کے سلسلے کے مقدمات کے فیصلوں اور جرائم کی سزاؤں میں یہ لوگ (نصاریٰ) خود ہی حاکم اور مختارِ مطلق ہیں۔ بے شک نماز جمعہ، عیدین، اذان اور ذبیحہ گاؤ جیسے احکام میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالتے، لیکن جو چیز ان سب کی جڑ اور آزادی کی بنیاد ہے، وہ قطعاً بے حقیقت اور پامال ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بے تکلف مسجدوں کو مسمار کر دیتے ہیں، عوام کی شہری آزادیاں ختم ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان یا غیر مسلم ان کی اجازت واطمینان کے بغیر اس شہر (دہلی) یا اس کے اطراف وجوانب میں نہیں آسکتا۔ عام مسافروں یا تاجروں کو شہر میں آنے جانے کی جو اجازت ہے، وہ بھی ملکی مفاد یا عوام کی شہری آزادی کی بنا پر نہیں بلکہ خود اپنے مفاد کی خاطر ہے۔ اس کے بالمقابل خاص خاص اور ممتاز ونمایاں حضرات ان کی اجازت کے بغیر اس ملک میں داخل نہیں ہو سکتے۔ دہلی سے کلکتے تک انہی کی عمل داری ہے۔ بے شک کچھ دائیں بائیں مثلاً حیدر آباد، لکھنؤ، رام پور میں چوں کہ وہاں کے فرماں رواؤں نے اطاعت قبول کر لی ہے، براہ راست نصاریٰ کے احکام جاری نہیں ہوتے۔“ [1]

شاہ عبدالعزیز نے اس فتوے کے علاوہ ایک اور فتویٰ بھی جاری کیا تھا، جس میں دلائل سے ثابت فرمایا کہ ہندوستان اب دارالحرب ہو گیا ہے۔ [2]

---

[1] فتاویٰ عزیزیہ (17/1)

[2] فتاویٰ عزیزیہ (105/1)

شاہ صاحب کے یہ دونوں فتوے اپنے مندرجات میں واضح ہیں۔ ان کی رو سے بلاشبہ اس زمانے میں ہندوستان دارالحرب تھا اور اس کی آزادی کے لیے انگریزی اقتدار سے جہاد ناگزیر تھا۔ چنانچہ مولانا اسماعیل دہلوی، سید احمد شہید اور ان کے رفقانے انگریزوں سے جہاد کا آغاز کیا اور پھر یہ سلسلہ کسی نہ کسی انداز اور صورت میں جاری رہا تا آں کہ 1947ء میں انگریزی اقتدار ختم ہوگیا اور برصغیر پاک وہند کو آزادی کی نعمت میسر آئی۔ مجاہدین کی اس تحریک کو ''وہابی تحریک'' کہا گیا، جس نے ایک سو اکیس برس عمر پائی۔

بنگال کی فرائضی تحریک

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک سے چند سال پیشتر بنگال میں ''فرائضی'' کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی تھی۔ اس کے بانی مولانا شریعت اللہ تھے، جو ضلع فرید پور کے موضع بہادر پور کے رہنے والے تھے۔ وہ اٹھارہ سال کی عمر میں حج بیت اللہ کے لیے گئے اور بیس سال مکہ معظّمہ میں مقیم رہے اور شیخ طاہر مکیؒ شافعی سے استفادہ کیا۔ 1802ء میں وہ ہندوستان آئے اور 1804ء میں فرائضی جماعت کے نام سے بنگال میں اسلام کی تبلیغ واشاعت میں مشغول ہوئے اور رسوم وبدعات کی بیخ کنی کی تحریک شروع کی۔ مولانا شریعت اللہ نامور عالم دین تھے۔ ان کی تحریک بھی تحریک مجاہدین کی طرح وہابیت کے نام سے معروف ہوئی۔ فرائضی تحریک کے بانی نے کاشت کاروں اور مزارعوں میں بالخصوص بہت کام کیا۔ وہ پیر اور مرید کے بجائے استاد اور شاگرد کے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ''الأرض للّٰہ'' ان کا نعرہ تھا، یعنی زمین اللہ کی ہے اور جو شخص اس میں کام کرتا ہے وہی اس کا مالک ہے۔ مولانا شریعت اللہ نے 1840ء میں وفات پائی۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے حاجی محسن میاں نے فرائضی تحریک کی قیادت

سنبھالی۔ بنگال کے عام مسلمان ان کو پیار سے ''دودھومیاں'' کے نام سے پکارتے تھے۔ باپ کی طرح یہ بھی سرگرم اور فعال کارکن تھے۔ فرائضی تحریک کے مقاصد میں انگریزوں کو بنگال سے نکالنا بھی شامل تھا۔ اس کے لیے انھوں نے بڑی قربانیاں دیں اور انگریزوں کے ہاتھوں بہت تکلیفیں اٹھائیں۔

نثار علی عرف ٹیٹو میر

جس زمانے میں سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی آزاد قبائل میں مصروف جہاد تھے، اسی زمانے میں بنگال میں ایک شخص نثار علی نمایاں ہو کر ابھرا، جو ''ٹیٹو میر'' کے عرف سے معروف تھا۔ یہ شخص کاشت کار تھا اور ایک زمیندار کے گھر اس کی شادی ہوئی تھی۔ سید احمد بریلوی کا عقیدت مند تھا۔ ٹیٹو میر کاشت کاروں کا حامی تھا اور ہزاروں کاشت کار اس کے ساتھ تھے، جو غیر مسلم زمینداروں کے جور وستم سے تنگ آچکے تھے۔ فرائضی تحریک بنگال کے مسلمانوں کی پہلی تحریک تھی، جس کا آغاز اس وقت کے اہل حدیث علمانے وہاں کے حالات کے مطابق ایک خاص انداز میں کیا۔

1831ء میں موضع پورنیا کے ایک زمیندار کشن رائے سے لوگ متعارف ہوئے۔ اس نے یہ ستم ڈھایا کہ اپنے ہر مسلمان کاشت کار پر جسے وہ وہابی کہتا تھا، ڈھائی روپے کا محصول لگادیا اور اس میں مزید اشتعال اس طرح پیدا کیا کہ اس محصول کو وہ ''ڈاڑھی کا ٹیکس'' کہہ کر وصول کرتا تھا۔ اپنے گاؤں میں تو اس نے یہ ٹیکس بغیر کسی جھگڑے کے وصول کرلیا، لیکن جب اس کے کارندے قریب کے گاؤں موضع سرفراز پور پہنچے تو وہاں اتفاق سے نثار علی عرف ٹیٹو میر اپنے معتقدین کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے کشن رائے کے کارندوں کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد فریقین میں سخت لڑائی ہوئی اور خوں ریزی تک نوبت پہنچی اور ٹیٹو میر اور اس کے بہت سے ساتھی جامِ شہادت نوش کرگئے۔

1857ء کی جنگ آزادی میں اہل حدیث کا حصہ

1857ء (1273ھ) کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو اس میں بھی اہل حدیث نے حصہ لیا اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی نے اس فتوے پر دستخط کیے جو انگریزوں کے خلاف جہاد کے لیے جاری کیا گیا تھا۔ فتوے کے کچھ عرصہ بعد حضرت میاں صاحب کو دہلی سے گرفتار کر کے وہاں سے بارہ تیرہ سو کلومیٹر دور راولپنڈی جیل میں قید کر دیا گیا۔ میاں صاحب ایک سال قید رہے۔ اس جنگ میں انگریز کامیاب ہوئے تو انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو جن میں بہت سے وہابی شامل تھے یا تو پکڑ کر پھانسی دے دیا یا عبور بہ دریائے شور کی سزا دی یعنی کالا پانی بھیج دیا۔

اس کے بعد وہابیوں پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے جنھیں برصغیر کی سیاسی تاریخ میں ''وہابی مقدمات'' کا نام دیا گیا۔ یہ پانچ مقدمات تھے جو انبالہ، عظیم آباد (پٹنہ)، مالدہ اور راج محل وغیرہ مقامات میں اہل حدیث علما وزعما کے خلاف قائم کیے گئے۔ مختصر الفاظ میں ان مقدمات کی روداد مندرجہ ذیل ہے۔

1- پہلا مقدمۂ بغاوت انبالہ

یہ مقدمہ چوں کہ انبالہ میں شروع ہوا تھا، اس لیے برصغیر کی سیاسی تاریخ میں اسے ''مقدمۂ انبالہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ یہ پہلا مقدمۂ بغاوت تھا۔ مقدمے کی ابتدائی کارروائی ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی کی عدالت میں شروع ہوئی جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس اثنا میں الزامات کی نوعیت، گواہوں کی ترتیب اور شہادتوں کی تفصیل مرتب کی گئی اور تمام ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا۔ سیشن عدالت میں باقاعدہ مقدمہ جاری ہوا۔ یہ گیارہ ملزم تھے، جن کے نام آگے درج کیے گئے ہیں۔

ملزم پہلے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں پیش ہوئے تو دورانِ مقدمہ میں نماز کا وقت ہوگیا۔ نماز کی اجازت طلب کی تو نہ ملی۔ پھر معمول یہ رہا کہ جوں ہی نماز کا

وقت ہوتا ملزم تیمّم کر کے اور بیٹھے ہوئے اشاروں سے نماز پڑھ لیتے۔ مقدمے کی سماعت جتنے دن ڈپٹی کمشنر کی عدالت میں ہوئی، تمام ملزم الگ الگ پھانسیوں کی کوٹھڑیوں میں بند رہے۔ جب مقدمہ سیشن سپرد ہوا تو سب کو حوالات میں اکٹھا کر دیا گیا۔ اب ماحول قدرے سازگار تھا اور تمام دوست اکٹھے رہتے تھے، اس لیے اذیتوں کا احساس تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ ان دنوں مولانا محمد جعفر تھانیسری فارسی کا اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

پائے در زنجیر پیش دوستاں
بہ کہ بہ بیگانگاں در بوستاں

یعنی دوستوں کے ساتھ اگر پاؤں میں زنجیر بھی ہو تو وہ بیگانوں کی رفاقت میں باغ میں رہنے سے بہتر ہے۔

مولانا یحییٰ علی تکلیفوں کے ان دنوں میں عام طور پر یہ رُباعی پڑھتے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے۔

لست أبالي حين أقتل مسلما على
أي شقّ كان لله مصرعي
وذلك في ذات الإله وإن يشأ
يبارك على أوصال شلو ممزع

یعنی جب میں مسلمان مارا جاؤں تو مجھے کچھ پروا نہیں کہ اللہ کی طرف میرا لوٹنا، اگرچہ کسی بھی طرح سے ہو۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے، وہ چاہے تو بوسیدہ ہڈیوں اور تمام اعضائے جسم میں برکت اور بالیدگی پیدا کر دے۔

ملزموں کے نام اور فیصلہ

ہم یہاں اس مقدمے کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے۔ اس موقعے پر صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سیشن جج کی عدالت میں مقدمہ چلا، بعض ملزموں نے بڑی بڑی فیسیں دے کر انگریز وکیلوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ لیکن عدالت نے 2۔مئی 1864ء کو مندرجہ ذیل ملزموں کا حسب ذیل فیصلہ سنایا:

1. شیخ محمد شفیع: سزائے موت، جاداد ضبط، لاش جیل کے قبرستان میں دفن کی جائے۔
2. مولانا یحییٰ علی: یہی سزا۔
3. مولانا محمد جعفر تھانیسری: سزائے موت، جاداد ضبط۔
4. مولانا عبدالرحیم: حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور، جاداد ضبط۔
5. قاضی میاں جان: یہی سزا۔
6. عبدالغفار: حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور، جاداد ضبط۔
7. منشی عبدالکریم: یہی سزا۔
8. الٰہی بخش: یہی سزا۔
9. عبدالغفور: یہی سزا۔
10. حسینی عظیم آبادی: یہی سزا۔
11. حسینی تھانیسری: یہی سزا۔

سزا سننے کے بعد ملزموں کے انگریز وکیلوں نے جوڈیشل کمشنر پنجاب کی عدالت میں اپیل دائر کی، جس کے نتیجے میں سزاؤں میں کچھ تخفیف ہوئی اور پہلے تین ملزموں کی سزائے موت کو حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ یہ فیصلہ 24۔اگست 1864ء کو صادر ہوا۔ جن تین بزرگوں کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل ہوئی، اس کی اطلاع انھیں 16۔ستمبر 1864ء کو ملی۔

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بتایا گیا، شیخ محمد شفیع، مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر (تینوں) کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ یہاں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ سزا سن کر مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری انتہائی خوش تھے۔ انگریز پولیس کپتان نے مولانا محمد جعفر سے اس خوشی کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ شہادت کی امید پر خوش ہیں، جو مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تم اس کو کیا جانو؟[1]

اس کے بعد ان کی سزائے موت ختم کردی گئی کہ ملزم اس سے خوشی محسوس کرتے تھے اور انھیں خوش کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ اس کے بجائے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی کہ موت کے مقابلے میں یہ زیادہ تلخ اور تکلیف دہ سزا ہوگی۔ شیخ محمد شفیع کی سزا صرف جاداد کی ضبطی تک محدود رکھی گئی۔ جن لوگوں کو پھانسی کی سزا ختم کر کے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا دی گئی، ان کے سر اور ڈاڑھی مونچھ مونڈ دیے گئے۔ مولانا یحییٰ علی ڈاڑھی کے کٹے ہوئے بال ہاتھ میں اٹھائے پھرتے اور کہتے: افسوس نہ کر تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی خاطر کاٹی گئی۔[2]

کالا پانی کو روانگی:

ان گیارہ ملزموں میں سے چار ملزموں، مولانا یحییٰ علی، میاں عبدالغفار، مولانا محمد جعفر تھانیسری اور مولانا عبدالرحیم کو کالا پانی بھیجا گیا۔ پہلے تین بزرگوں کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈال کر انبالہ سے پیدل لدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر کے راستے لاہور لایا گیا اور کچھ عرصہ لاہور سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد ریل گاڑی کے ذریعے ملتان اور وہاں سے کشتی میں سوار کر کے کوٹری پہنچایا گیا۔ کوٹری سے کراچی اور کراچی سے بادبانی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچے۔ 8۔ دسمبر 1864ء کو بمبئی سے جمنا جہاز میں

[1] کالا پانی (از مولانا محمد جعفر تھانیسری) (ص: 68)
[2] کالا پانی (از مولانا محمد جعفر تھانیسری) (ص: 68)

سوار ہوئے جو بحری جہاز تھا اور چونتیس دن کے بعد 11۔جنوری 1865ء کو پورٹ بلئیر (جزیرۂ انڈمان) میں اترے۔

اس سے کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالرحیم کو انبالہ جیل سے نکالا گیا، وہ بیمار تھے۔ لاہور پہنچے تو ایک سال آٹھ مہینے لاہور سنٹرل جیل میں رہے۔ اس کے بعد ملتان، کوٹری، کراچی اور بمبئی کے راستے کالا پانی پہنچے۔ ان کا یہ سفر نہایت اذیت ناک تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ خود بیمار تھے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جس جہاز میں یہ سوار تھے، اس کے تمام مسافر مختلف امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ سمندر میں طوفان آگیا، جس کے باعث جہاز تیئیس (23) دن کے بجائے ایک مہینا اکیس دن میں پورٹ بلئیر پہنچا۔

2- عظیم آباد کا پہلا مقدمۂ بغاوت

مولانا یحییٰ علی وغیرہ کے مقدمے کا فیصلہ ہوجانے کے بعد جو دراصل پہلا مقدمۂ بغاوت تھا، عظیم آباد (پٹنہ) میں مولانا احمد اللہ پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ ترتیب کے اعتبار سے دوسرا مقدمۂ بغاوت تھا۔ لیکن عظیم آباد (پٹنہ) کے دو مقدموں میں سے پہلا تھا۔

مولانا احمد اللہ اپنے علم وفضل، زہد وعبادت اور فہم وتدبر کی بنا پر عظیم آباد اور اس کے گردونواح میں نہایت اعزاز واحترام کے مالک تھے۔ مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی تھے۔ اپنے علاقے کے رئیس تھے۔ مولوی الٰہی بخش جعفری کے فرزند تھے۔ 1223ھ (1808ء) میں پیدا ہوئے، والد نے احمد بخش نام رکھا تھا، سید احمد شہید سے وابستگی پیدا ہوئی تو انھوں نے احمد اللہ نام رکھا اور پھر اسی نام سے شہرت پائی۔ مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر اساتذہ سے دینی علوم حاصل کیے۔ 1857ء کے ہنگامے میں تقریباً تین مہینے سرکٹ ہاوس میں نظر بند رہے۔

عظیم آباد کے اس پورے خاندان کو حکومتِ انگریزی نے مبتلائے مصیبت کر دیا تھا اور سب حضرات پر بہت سے مقدمات قائم کر دیے گئے تھے۔ مولانا احمد اللہ کے فرزند حکیم عبدالحمید نے ''شہر آشوب'' کے نام سے فارسی میں ایک مثنوی لکھی تھی، جس میں اس تمام ابتلا کی تفصیل بیان کی تھی۔ اس مثنوی میں مولانا احمد اللہ کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی کی اس سزا کا ذکر بھی دردناک انداز میں کیا ہے جو ایک سال پہلے انبالہ میں دی گئی تھی۔

29۔رمضان 1281ھ (27۔فروری 1865ء) کو مولانا احمد اللہ کے لیے سزا کا حکم جاری کیا گیا۔ پہلے ضبطیِ جاداد اور پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ پھر اسے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا گیا۔ مولانا کو پھانسی کے حکم سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ سزا سن کر اسی طرح خوش وخرم تھے، جس طرح ان کے چھوٹے بھائی مولانا یحییٰ علی تھے۔

جاداد کی ضبطی اور نیلامی

جاداد کی ضبطی اور حبسِ دوام کی سزا سے ان حضرات کو کوئی غم نہ تھا، اس قسم کی سب تکلیفیں ذاتی طور پر یہ حضرات نہایت صبر وتحمل سے برداشت کر سکتے تھے۔ اصل غم یا تکلیف اہل وعیال کی تھی، جو جاداد ضبط ہو جانے کی وجہ سے بے گھر ہو گئے تھے اور سر چھپانے کے لیے کوئی جگہ ان کے پاس نہ رہی تھی، گزر اوقات کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ ان کی منقولہ جاداد کی نیلامی کا مسئلہ سامنے آیا تو عظیم آباد (پٹنہ) کے مسلمانوں نے متفقہ طور پر بولی نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاہم انگریزوں نے جوشِ انتقام میں لاکھوں کی جاداد کوڑیوں میں فروخت کر دی۔ نیلامی سے تقریباً ستتر (77) سال بعد 1935ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت 1937ء کے انتخابات کے نتیجے میں صوبہ بہار میں کانگرس کی وزارت بنی تو 1939ء میں حاجی پور کے دیہاتی حلقے کے رکنِ اسمبلی مسٹر بدرالحسن نے بہار اسمبلی میں ان جادادوں کی قیمت اور نیلامی کے بارے میں

سوال اٹھایا تو حکومت کے ایک وزیر نے اس منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی جو رمضان المبارک 1281ھ (فروری 1865ء) کو انگریزوں نے ضبط کی تھی، تفصیل بتائی۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جاداد منقولہ میں ان تینوں حضرات (مولانا عبدالرحیم، مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ) کی کتابیں، فرنیچر، یکے، گھوڑے، پالکیاں، زیور وغیرہ بیش قیمت چیزیں شامل تھیں، جو نہایت ہی تھوڑی رقم میں نیلام ہوئیں۔

اس کے بعد ان کے مکانات منہدم کرادیے گئے اور ان کے محلّہ صادق پور کا احاطہ عظیم آباد (پٹنہ) کی میونسپل کمیٹی کو دے دیا گیا۔ اس میں وہ جگہ بھی شامل تھی جسے ''قافلہ'' کہا جاتا تھا، اور اسے ''قافلہ'' اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہاں مجاہدین اور اس جماعت کے کارکن قیام کرتے تھے۔ اس تمام جگہ پر پٹنہ میونسپل کمیٹی کی عمارت تعمیر ہوئی۔

عورتوں اور بچوں کی حالتِ زار

مولانا احمد اللہ کے اہل وعیال کو عید کے دن ان کے گھروں سے نکالا گیا تھا۔ تمام عورتیں اور بچے انتہائی پریشانی کے عالم میں تھے۔ نہ رہنے کے لیے مکان اور نہ استعمال کے لیے کوئی سامان...... ایک خوش حال گھرانا نہایت بے چارگی اور بے بسی کا شکار ہوگیا تھا۔ مولانا احمد اللہ کے بیٹے حکیم عبدالحمید نے جو بہت اچھے عالم اور شاعر تھے، ''مثنوی شہر آشوب'' میں تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے۔

مثنوی کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے:

جب عید کی رات ختم ہوئی اور ہمارے اہل وعیال نے صبح کی تو سب کو مکان سے نکال دیا گیا۔

تمام مال ومتاع ضبط اور برباد ہوا۔ نقدی، غلہ، سامان اور زراعت ہر شے ختم ہوگئی۔ ہمارے لیے آہ کرنا بھی سخت جرم تھا اور تمام سامان میں سے سُوئی تک اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ میں اکیلا نہ تھا، میرے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ بچے، عورتیں،

اور ان کی آہ وفریاد تھی۔ حکومت کا مجرم تو احمد اللہ تھا، بے گناہ بال بچوں کا کیا قصور تھا۔

ہماری زندگی کا سرمایہ موت کا سامان بن گیا...... ہماری عید محرم کا چاند ہوگئی۔ میں زندہ تھا، لیکن مُردوں کی سی حالت میں۔ میرے لیے زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی۔

مثنوی لکھنے والے حکیم عبدالحمید طبابت کرتے تھے اور ان کا اچھا خاصا دوا خانہ تھا۔ وہ بھی حکومت نے ضبط کرلیا۔ یعنی گزر بسر کے لیے کوئی چیز ان کے پاس باقی نہ رہنے دی۔ کتابیں اور کپڑے وغیرہ کوئی شے ان کے قبضے میں نہ تھی۔ کتابوں کی ضبطی سے انھیں بالخصوص بہت تکلیف پہنچی، فرماتے ہیں۔

کتبِ ملتِ مسلماناں
رفت در دستِ حرف ناخواناں

یعنی مسلمانوں کی دینی ومذہبی کتابیں اَن پڑھ لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئیں۔

مولانا احمد اللہ کو کالے پانی لے جانے کے لیے کب عظیم آباد (پٹنہ) سے روانہ کیا گیا، اس کی صحیح تاریخ کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد جعفر تھانیسری اور میاں عبدالغفار سے بہت پہلے 10۔ جون 1865ء کو وہاں پہنچ گئے تھے۔

3- مالدہ کا مقدمۂ بغاوت

ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں مجاہدین کے جو مراکز قائم تھے، ان میں ایک مرکز مالدہ تھا۔ یہ مرکز صوبہ بنگال میں تھا۔ ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کا انگریز مصنف ڈاکٹر ہنٹر 1870ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے (کتاب کے صفحہ 119 پر) لکھتا ہے کہ وہابیوں کی تحریک جہاد کا یہ مرکز ''تقریباً تیس سال'' پہلے قائم ہوا تھا۔ اس حساب سے اس مرکز کی بنیاد 1840ء کے لگ بھگ پڑی۔ اس مرکز میں

ضلع مالدہ کے علاوہ اس کے متصلہ اضلاع مرشد آباد اور راج شاہی کے بعض حصے بھی شامل تھے...... اس کے بانی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ایک خلیفہ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی تھے جو مجاہدین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اس سلسلے میں جنوبی بنگال کے ضلع مالدہ میں گئے تو وہاں خدمتِ مجاہدین کے لیے حالات سازگار معلوم ہوئے اور اس ضلع کے ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی۔ شادی بھی وہیں کی اور مدرس کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے زمینداروں اور دیگر لوگوں نے ان سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ہنٹر کے بقول وہ انتہائی پُرجوش واعظ تھے اور بہت ہی مؤثر انداز میں لوگوں کو انگریز کے خلاف دعوتِ جہاد دیتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کثیر تعداد میں نوجوان ان کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہوگئے۔ وہ لوگوں سے باقاعدہ رقوم وصول کر کے عظیم آباد (پٹنہ) کے مرکز میں بھیجتے، تاکہ یہ رقوم سرحد پار کے مجاہدین کو پہنچائی جائیں۔

جو لوگ مولانا عبدالرحمٰن لکھنوی کے ماتحت بنگال کے مختلف مقامات سے رقوم فراہم کرنے پر متعین تھے، ان میں ایک شخص رفیق منڈل تھے۔ کئی سال وہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ 1853ء میں حکومت کو رفیق منڈل کے متعلق اعانتِ مجاہدین کا شبہ ہوا۔ ان کی تلاشی لی گئی تو کچھ ایسے خطوط برآمد ہوئے، جن سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کا تعلق مجاہدین سے ہے۔ چنانچہ انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ کچھ عرصے بعد وہ رہا ہوئے تو تمام جماعتی کاربار جو وہ خود انجام دیتے تھے، اپنے بیٹے مولوی امیرالدین کے سپرد کر دیا۔

مولوی امیرالدین انتہائی سرگرم آدمی تھے اور ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ دریائے گنگا کے دونوں کناروں اور اس کے جزیروں میں آباد مسلمانوں اور اضلاعِ مالدہ، مرشد آباد اور راج شاہی میں وہ نہایت اثر ورسوخ کے مالک تھے۔ ان کے

اخلاص اور قوتِ کار کی وجہ سے سب لوگ ان کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے......
مولوی امیر الدین نے جو لوگ جہاد کے لیے سرحد بھیجے ان کی صحیح تعداد بتانا تو مشکل ہے، البتہ ہنٹر کا کہنا ہے کہ مجاہدین کی ایک سرحدی چوکی کے چار سو تیں آدمیوں میں سے کم وبیش دس فی صد وہابی مجاہد انہی کے بھیجے ہوئے تھے۔

بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں مجاہدین کے لیے بے حد تکریم کے جذبات پائے جاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس سے قبل مولانا عنایت علی عظیم آبادی اس علاقے میں بہت کام کر چکے تھے اور لوگوں پر ان کی نیکی اور مخلصانہ کارکردگی کا بے پناہ اثر تھا۔

مولوی امیر الدین پر انگریزی حکومت کے خلاف سازش اور بغاوت کا مقدمہ 1870ء میں مالدہ میں قائم ہوا۔ انھیں ضبطیِ جاداد اور حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ 1872ء میں وہ کالا پانی پہنچے۔ دس گیارہ سال کی سختی اور جلاوطنی کے بعد 1883ء (1300ھ) میں کالا پانی سے رہا ہو کر واپس وطن آئے۔

یہ تیسرا مقدمہ تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور اعانتِ مجاہدین کے جرم میں وہابیوں کے خلاف قائم ہوا۔ انگریزوں کے نزدیک اسے ''مقدمۂ بغاوت مالدہ'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

4- راج محل کا مقدمۂ بغاوت

مالدہ کے مقدمۂ بغاوت کے تھوڑا عرصہ بعد 1870ء میں وہابیوں کے خلاف چوتھا مقدمۂ بغاوت راج محل میں قائم کیا گیا۔ اس مقدمے کا اصل نشانہ ابراہیم منڈل تھے جو راج محل کے نواح میں ایک مقام اسلام پور کے رہنے والے تھے۔ راج محل صوبہ بہار کی بھاگل پور کمشنری میں واقع ہے۔

ابراہیم منڈل بہت باہمت اور تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ) کے بزرگانِ دین سے ان کا تعلق تھا۔ جماعتِ مجاہدین کے سرگرم کارکن تھے۔ علاقۂ سرحد

میں نقد روپے بھی بھیجتے تھے اور جہاد کے لیے آدمی بھی روانہ کرتے تھے۔ ہنٹر نے اپنی تصنیف ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں جس انداز میں ان کا ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کے نزدیک یہ بہت خطرناک آدمی تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ 1870ء میں جب وہابی تحریک کے مرکزوں پر دھاوا بولا گیا تو ابراہیم منڈل ان لوگوں میں سے تھے، جن کو خاص طور پر مقدمۂ سازش کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''ان کی سازش کا جال کسی بھی کمزور حکومت کو مرعوب کرنے لیے کافی تھا۔''

ابراہیم منڈل کو اکتوبر 1870ء میں حبسِ دوام بہ عبور دریاے شور اور ضبطیِ جاداد کی سزا ہوئی۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری جو ان دنوں خود جزائر انڈمان میں عمر قید کاٹ رہے تھے، اپنی کتاب ''کالا پانی'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''ایک بوڑھے اور ضعیف شخص ابراہیم منڈل کو اسلام پور میں پکڑا اور اپنے معمولی اور پُرانے گواہوں سے جو چاہا گواہی دلوا کر بے چارے کو کالا پانی روانہ کردیا۔''

5- عظیم آباد کا دوسرا مقدمۂ بغاوت

عظیم آباد (پٹنہ) میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت اور سازش کا پہلا مقدمہ 1865ء میں مولانا احمد اللہ کے خلاف دائر ہوا تھا۔ اس سے چھ سال بعد 1871ء میں دوسرا مقدمہ قائم ہوا۔ اس مقدمے میں سات ملزم تھے، جن کے نام یہ ہیں:

(1) مولانا مبارک علی۔ (2) مولانا تبارک علی۔ (3) حاجی دین محمد۔ (4) حاجی امین الدین۔ (5) پیر محمد۔ (6) حشمت داد خان اور (7) امیر خاں۔

ابتدائی سماعت انگریز مجسٹریٹ باربور کی عدالت میں یکم مارچ 1871ء کو شروع ہوئی، 27۔ مارچ کو فرد جرم عائد کر کے ملزموں کو سیشن سپرد کر دیا گیا۔ یکم مئی 1871ء سے مقدمے کی سماعت مسٹر پرنسپ سیشن جج نے شروع کی۔ حکومت کی طرف سے

گرفتار شدگان پر الزام ثابت کرنے کے لیے ایک سو چھتیس گواہوں کی طویل فہرست عدالت کو دی گئی، لیکن ایک سو تیرہ آدمی پیش ہوئے۔ چھیالیس آدمیوں نے ملزموں کی طرف سے شہادت دی۔ درمیان میں کچھ دن سماعت ملتوی رہی۔ 1871ء کے آخر میں مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا۔

یہ انیسویں صدی عیسوی اور تیرھویں صدی ہجری کا آخری بڑا مقدمۂ سازش تھا جو ''بڑا وہابی مقدمہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

اس مقدمے کے ملزم مولانا مبارک علی کو مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد صادق پور کے مرکزِ مجاہدین کا نگران مقرر کیا گیا تھا۔ پہلے یہ 1868ء میں گرفتار ہوئے، اس کے بعد 1871ء کے مقدمے میں پکڑے گئے اور انھیں اس قدر مبتلائے اذیت کیا گیا کہ حالتِ قید ہی میں وفات پا گئے۔

مولانا تبارک علی پر جو مولانا مبارک علی کے بیٹے تھے، یہ الزام تھا کہ 1862ء کی جنگ میں جو سرحد میں امبیلا کے مقام پر مجاہدین نے انگریزوں کے خلاف لڑی تھی، یہ اس وقت کے امیر مجاہدین مولانا عبداللہ کے ساتھ شریکِ جہاد تھے اور مجاہدین کے ایک دستے کی کمان ان کے سپرد تھی۔ اس جرم میں انھیں حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ مارچ 1872ء میں مولانا امیر الدین وغیرہ کے ساتھ کالا پانی پہنچے۔ دس برس قید کاٹنے کے بعد رہا ہوئے۔ حاجی دین محمد اور پیر محمد کو کئی مرتبہ گرفتار کیا گیا اور مختلف جیلوں میں رکھا گیا۔ اسی طرح حاجی امین الدین کو بھی بار بار پکڑا گیا اور متعدد مقدموں میں کئی دفعہ الجھایا گیا۔

جماعت مجاہدین کے بعض معاونین

معرکۂ بالاکوٹ کے بعد حالات کی رفتار نے ایسا رخ اختیار کیا کہ جماعت مجاہدین کے اصل معاون اہل حدیث حضرات ہی ہوئے اور انہی کا اس جماعت سے

تعلق رہا۔ مذکورہ بالا وہابی مقدماتِ خمسہ کی زد میں بھی یہی لوگ آئے۔ ان مقدمات کا دائرۂ تفصیل تو دور تک پھیلا ہوا ہے لیکن یہاں نہایت اختصار کے ساتھ اشاروں سے کام لیا گیا ہے۔

اب جماعت مجاہدین کے بعض معاونین کا تذکرہ بہت ہی اختصار کے ساتھ۔

- مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی جلالتِ علمی کی تمام برصغیر میں شہرت تھی۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے صاحبِ تصانیف شاگرد تھے اور جماعت مجاہدین کے معاون۔ انھوں نے 9۔ ربیع الاول 1329ھ (10۔ مارچ 1911ء) کو وفات پائی۔
- حضرت مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی برصغیر کے رفیع المنزلت عالم تھے۔ انھوں نے جماعت مجاہدین کی ہمیشہ مالی اور افرادی امداد کی۔ چوں کہ انگریزی حکومت کی یہ شدید مخالف جماعت تھی، اس لیے اس کے کسی بھی طرح کے معاونین انگریزوں کے نزدیک سخت معتوب تھے۔ مولانا ممدوح بھی ہمیشہ ان کے زیرِ عتاب رہے۔ وہ 4۔ جمادی الاخریٰ 1336ھ (17۔ مارچ 1918ء) کو فوت ہوئے۔
- قاضی محمد سلیمان منصور پوری مشرقی پنجاب کی سابق سکھ ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ یہ بہت بڑا منصب تھا، جس پر وہ فائز تھے۔ انھوں نے خفیہ طور سے جماعت مجاہدین کی بے حد مالی مدد کی۔ ان کا سانحۂ ارتحال یکم محرم 1349ھ (30۔ مئی 1930ء) کو پیش آیا۔
- مولانا عبدالقادر قصوری علمی اور سیاسی اعتبار سے بلند مرتبت شخصیت تھے۔ وہ خود اور ان کے فرزندان گرامی ہمیشہ جماعتِ مجاہدین سے منسلک رہے۔ مولانا موصوف کا انتقال 6۔ ذیقعدہ 1361ھ (16۔ نومبر 1942ء) کو ہوا۔
- مولانا محی الدین احمد قصوری جماعت اہل حدیث کے مشہور بزرگ اور مولانا

عبدالقادر قصوری کے بڑے بیٹے تھے۔ انگریزی حکومت نے ان کو سخت سزائیں دیں۔ تین سال دسوہہ ضلع جالندھر میں نظر بند کیے رکھا۔ ان کا جرم برصغیر کو انگریزوں سے آزاد کرانا اور جماعت مجاہدین کی معاونت تھا۔ ان کی تاریخ وفات 26۔ ذیقعدہ 1390ھ (24۔ جنوری 1971ء) ہے۔

❁ مولانا محمد علی قصوری ایم اے کینٹب بھی مولانا عبدالقادر قصوری کے فرزندِ دلبند تھے۔ وہ طویل عرصے تک جماعت مجاہدین کے مرکز میں رہے اور اس جماعت کی بے حساب مالی مدد بھی کی۔ انھوں نے 26۔ جمادی الاولیٰ 1375ھ (12۔ جنوری 1956ء) کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

❁ مولانا محمد علی لکھوی مدنی، پنجاب کے بہت بڑے علمی خاندان کے ممتاز فرد تھے۔ ان کا شمار جماعتِ مجاہدین کے خاص معاونین میں ہوتا تھا۔ وہ 23۔ ذیقعدہ 1393ھ (19۔ دسمبر 1973ء) کو اس دنیاے فانی سے عالم جاودانی کو روانہ ہوئے۔ قبرستان جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں مدفون ہیں۔

❁ حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی برصغیر کے معروف علمی خانوادے کے نامور رکن تھے۔ لاہور کی چینیاں والی مسجد کے خطیب تھے۔ جماعت مجاہدین کی اعانت کی بنا پر انگریزی حکومت کے اعلیٰ حکام کا ان سے بازپرس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا ممدوح 1349ھ (1930ء) کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوئے۔

❁ حافظ عبدالستار عمر پوری 1301ھ (1884ء) کو موضع عمر پور (ضلع مظفر نگر یوپی) میں پیدا ہوئے۔ وہ مولانا عبدالغفار حسن کے والد گرامی تھے اور جماعتِ مجاہدین سے تعلق رکھتے تھے۔ انگریزی پولیس ان کے تعاقب میں رہتی تھی۔ آخری دفعہ ان کے وارنٹ گرفتاری لے کر پولیس یکم جمادی الاولیٰ 1334ھ (6۔ مارچ 1916ء) کی شام کو ان کے گھر پہنچی جب کہ اس تاریخ کی صبح کو وہ

وفات پا چکے تھے اور انھیں دفن بھی کیا جا چکا تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

یہ چند حضرات کے اسمائے گرامی ہیں ورنہ بے شمار حضرات تھے جو مرکزِ مجاہدین میں باقاعدہ خطیر رقوم بھیجتے تھے، جن میں مولانا عین القضاۃ لکھنوی، مولانا زین العابدین (ڈھاکا) ڈاکٹر محمد فرید (دربھنگا) شیخ عطاء الرحمٰن بانی مدرسہ رحمانیہ دہلی، حافظ حمید اللہ دہلی، مولانا محمد ابراہیم بنارسی، حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، قاضی عبدالرحیم (گوجراں والا)، مولانا عبدالخبیر عظیم آبادی، حکیم نورالدین لائل پوری، سیٹھ محمد داود دہلی، حاجی عطاء اللہ اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) اور دیگر بے شمار حضرات شامل ہیں۔ ہر ایک کے نہ نام لکھے جاسکتے ہیں، نہ ان کا تعارف کرایا جاسکتا ہے۔

چند اور مشہور شخصیتیں

ان بزرگانِ دین کے علاوہ کتنے ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے مستقل طور سے مرکز مجاہدین کو اپنا مسکن قرار دیا اور اس راہِ صواب میں اپنی زندگیاں وقف کردیں۔ ان میں ایک بزرگ صوفی ولی محمد (فتوحی والا، ضلع قصور) تھے۔ اسی طائفہ مقدسہ کے ایک رکن مولانا محمد بشیر تھے، جنھیں رمضان المبارک 1353ھ کی پہلی رات کو ایک شخص عبدالحلیم نے مرکزِ مجاہدین چمرکنڈ میں شہید کردیا تھا۔ مولانا محمد بشیر دراصل ضلع فیروز پور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں ''ملوال'' سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ 1302ھ (1885ء) میں پیدا ہوئے۔ جلیل القدر عالم تھے۔ 1333ھ (1915ء) میں مرکزِ مجاہدین میں پہنچے۔ نہایت معاملہ فہم اور مدبر تھے۔ جماعت مجاہدین ہی ان کی سرگرمیوں کا اصل محور قرار پائی تھی۔

جماعت مجاہدین کی اہم شخصیتوں میں سے ایک شخصیت مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کی تھی۔ وہ 27۔رمضان المبارک 1299ھ (12۔اگست 1882ء) کو

وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ 1900ء میں میٹرک پاس کر کے محکمۂ ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ لیکن جلد ہی ملازمت ترک کر کے 1903ء میں اسمست پہنچ گئے جو اس وقت مجاہدین کا مرکز تھا اور جماعت کے امیر مولانا عبدالکریم تھے۔ جماعت مجاہدین میں انھوں نے بے حد خدمات سرانجام دیں اور کئی دفعہ انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کیا اور کافی عرصہ جیلوں میں بند رہے۔ مرکزی امیر کی طرف سے ان کو ہندوستان میں جماعت مجاہدین کے امیر مقرر کر دیا گیا تھا۔

خفیہ طور سے وہ پورے ملک میں گھومتے اور جماعت کے پروگرام کے مطابق انگریزی حکومت کے خلاف پراپیگنڈا کرتے تھے۔ حکومت نے ان پر بہت سے مقدمات قائم کر دیے تھے۔ دفعہ 302 کے تحت ان پر قتل کا مقدمہ بھی قائم کیا گیا تھا۔ یہ تعجب انگیز بات ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی انگریزی حکومت کے قائم کردہ مقدمات میں وہ ملوث رہے، چنانچہ سالہا سال کی روپوشی اور جلاوطنی کے بعد جب کہ برصغیر کی آزدی کو آٹھ مہینے کا عرصہ بیت چکا تھا، وہ 17۔ جمادی الاخریٰ 1367ھ (27۔ اپریل 1948ء) کو اپنے وطن وزیر آباد آئے تو انھیں انگریزی دور کے قائم شدہ مقدمات کے تحت پاکستانی حکومت نے گرفتار کر لیا۔ اس پر لوگوں نے حکومت پاکستان سے سخت احتجاج کیا اور گورنر جنرل، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو تار بھیجے تو انھیں رہا کر دیا گیا۔ مولانا ممدوح نے 29۔ رجب 1370ھ (5۔ مئی 1951ء) کو وزیر آباد میں وفات پائی اور ان کی وصیت کے مطابق بالاکوٹ میں دفن کیے گئے۔

جماعتِ مجاہدین کے عالی قدر ارکان میں ایک رفیع المنزلت رکن صوفی عبداللہ تھے جو 1304ھ (1887ء) کے لگ بھگ وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی زندگی مختلف منزلوں سے گزری اور تقریباً 1320ھ (1902ء) میں جماعت مجاہدین میں شامل ہوئے۔ پھر جلد ہی مرکزِ مجاہدین میں چلے گئے۔

جماعت کی بے پناہ خدمت کی اور اس راہ میں شدید ترین اذیتیں برداشت کیں۔ پوری جوانی اس راہ میں صرف کردی۔ 1341ھ (1923ء) کے پس وپیش اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) آئے اور وہاں دار العلوم تعلیم الاسلام کے نام سے مدرسہ جاری کیا۔ اس دار العلوم سے بے شمار طلبا و علما نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اوڈاں والا سے تین میل کے فاصلے پر ماموں کانجن میں جامعہ تعلیم الاسلام کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ جامعہ کئی ایکٹر زمین میں پھیلی ہوئی ہے۔

صوفی عبداللہ مرحوم مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ان کی قبولیتِ دعا کے واقعات نہایت حیرت انگیز ہیں۔ میں نے ان کے حالات میں ''تذکرہ صوفی محمد عبداللہ'' کے نام سے مستقل کتاب لکھی ہے جو ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔

صوفی عبداللہ نے 14۔ربیع الثانی 1395ھ (28۔اپریل 1975ء) کو وفات پائی اور جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کے احاطے میں دفن کیے گئے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کو جماعت مجاہدین سے خاص تعلق تھا۔ اس کے امیر مولانا عبدالکریم کا مولانا آزاد سے رابطہ رہتا تھا اور اس کے مختلف ارکان بھی خفیہ طور پر مولانا سے میل جول رکھتے تھے۔ امیر صاحب کی درخواست پر ایک مرتبہ مولانا آزاد نے ایک نوجوان ڈاکٹر بھی علاج معالجے کے لیے وہاں بھیجا تھا جو مولانا کے حلقۂ عقیدت سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ ڈاکٹر کچھ عرصہ وہاں رہا تھا۔

یہ ہے جماعت مجاہدین اور اس کے بعض معاونین کا مختصر سا تعارف۔ یہ تمام لوگ مسلکِ اہل حدیث سے وابستہ تھے اور ان کی سیاسی تگ و تاز کا اصل مقصد برصغیر کو انگریزی حکومت کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانا تھا۔

جمعیت علماے ہند کا قیام

علاوہ ازیں برصغیر میں جو سیاسی جماعتیں قائم ہوئیں، ان میں بھی اہل حدیث

عوام وخواص نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ بعض جماعتوں کا قیام ہی اہل حدیث علما وزعما کی کوششوں سے ہوا۔ مثلاً 1919ء کے آخر میں جمعیت علماے ہند کا قیام مولانا ثناء اللہ امرتسری کی سعی سے عمل میں آیا اور اس کی پہلی کانفرنس جو یکم جنوری 1920ء کو امرتسر میں بہ صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی منعقد ہوئی تھی، اس کے صدر استقبالیہ مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے۔ انھوں نے تحریری خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا۔ پھر مفتی کفایت اللہ دہلوی کو جمعیت علماے ہند کے صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی کو ناظم اعلیٰ انہی مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز وتحریک سے بنایا گیا تھا۔ اس وقت ملک کی تمام سیاسی جماعتیں متحد تھیں۔ امرتسر ہی میں موتی لال نہرو کی صدارت میں کانگرس کا اجلاس ہوا تھا، اسی پنڈال میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں آل انڈیا مجلس خلافت کا اور اسی میں حکیم محمد اجمل خاں کے زیرِ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس کے صدر استقبالیہ بھی مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے اور انھوں نے تحریری خطبہ استقبالیہ ارشاد فرمایا تھا۔

مجلس احرار کا قیام

1929ء میں مجلس احرار قائم ہوئی تو مولانا سید محمد داود غزنوی اس کے بانیوں میں سے تھے اور انھیں اس کے ناظم اعلیٰ بنایا گیا تھا۔

مولانا عبدالقادر قصوری 1920ء سے لے کر 1930ء تک پنجاب کانگرس کے صدر رہے۔ مجلس خلافت کی صدارت بھی کئی سال ان کے سپرد رہی۔

مولانا ابوالقاسم بنارسی (متوفی 25۔نومبر 1949ء...... 3۔سفر 1369ھ) نے آزادیِ وطن کے لیے حالات کے مطابق سیاسی جماعتوں میں شمولیت کی اور قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ وہ جماعتِ مجاہدین کے بھی بہت بڑے معاون تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی زندگی سے بھی لوگ آگاہ ہیں۔ ریشمی رومال کی

تحریک میں بھی یہ حضرات شامل تھے اور اس موضوع کی کتابوں میں بہت سے اہل حدیث علما و زعما کے نام درج ہیں۔ صوبہ سرحد کی خدائی خدمت گار جماعت میں بھی بے شمار اہل حدیث سرگرم عمل رہے اور قید ہوئے۔ تفصیل کا یہ محل نہیں۔ اس موضوع کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ عرض صرف یہ کرنا مقصود ہے کہ برصغیر کی آزادی کے لیے جماعت اہل حدیث ہمیشہ سرگرمِ عمل رہی۔

❀❀❀❀❀
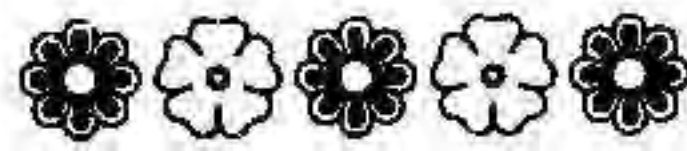
چھٹا باب

عربی ادبیات

برصغیر کے خطۂ ارض میں بے شمار اصحاب علم اور اربابِ تحقیق نے جنم لیا۔ یہ علاقہ سرزمین عرب سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ لیکن عربی زبان کو یہاں کے لوگوں نے اپنی زبان قرار دیا اور اس زبان میں وہ مہارت پیدا کی کہ خود اہل عرب کو اس پر انتہائی تعجب ہوا۔

مشہور دیو بندی عالم و مصنف مولانا سعید احمد اکبر آبادی کہا کرتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں عربی کے تین جلیل القدر ادیب پیدا ہوئے اور تینوں وہابی۔ وہ ہیں:

مولانا محمد سورتی۔

مولانا عبدالمجید حریری بنارسی۔

علامہ عبدالعزیز میمن۔!

یعنی برصغیر میں یہ اعزاز اہل حدیث کے حصے میں آیا کہ عربی ادبیات میں ان کے علما سب پر فوقیت لے گئے۔

علامہ عبدالمجید حریری سے متعلق مجھے معلومات میرے عزیز دوست مولانا عارف جاوید محمدی (کویت) نے ارسال کیں۔ اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ان کی جانب سے اس قسم کی علمی کرم نوازیوں کا سلسلہ اس فقیر کے لیے جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزاے خیر عطا فرمائے۔

علامہ عبدالعزیز میمن کے متعلق 24، 25 فروری 2003ء کو علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ایک سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا تھا، جس میں ہندوستان کے

متعدد اہل علم نے عربی، اردو، انگریزی میں مقالے پڑھے۔ پھر یہ مقالے ''علامہ عبدالعزیز میمنی۔ حیات وخدمات'' کے نام سے کتابی شکل میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی کی طرف سے شائع ہوئے ۔ یہ کتاب 541 صفحات پر مشتمل ہے جو مجھے مولانا رفیق احمد رئیس سلفی نے جون 2007ء کو علی گڑھ سے ارسال کی۔ اس پر ان کا شکریہ ادا کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔

مولانا محمد سورتی کے حالات میں ایک مقالہ پیش نگاہ ہے جو محترمہ فرزانہ لطیف نے لکھا اور ہمارے دوست ضیاء اللہ کھوکھر نے اپنے ادارے ندوۃ المحدثین گوجراں والا کی طرف سے شائع کیا۔ کھوکھر صاحب کا گوجراں والا میں بہت بڑا کتب خانہ ہے اور وہ علمائے کرام سے بے حد تعلق رکھتے ہیں۔ دو سو سے زیادہ صفحات کا یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع کر کے کھوکھر صاحب نے بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔

اب آیئے آیندہ صفحات میں برصغیر کے عربی کے ان تینوں رفیع المنزلت ادیبوں کا تذکرہ ملاحظہ فرمایئے۔ یہ تذکرہ مختصر الفاظ میں کیا گیا ہے۔

1- مولانا محمد سورتی

حضرت مولانا محمد سورتی ہندوستان کے صوبہ گجرات کے شہر ''سورت'' کے ایک گاؤں ''سامروذ'' میں 1307ھ (1886ء) کو پیدا ہوئے۔

ان کی کنیت ابوعبداللہ تھی اور والد محترم کا نام محمد یوسف تھا۔ ان کا شجرۂ نسب خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ فاروقی ہوئے۔

ان کی پیدائش تو سامرود میں ہوئی لیکن زیادہ عرصہ سورت میں رہنے کی وجہ سے سامرودی کے بجائے سورتی کہلاتے تھے۔ ان کا حلیہ ان کے شاگرد رشید جناب رئیس احمد جعفری نے ''دید وشنید'' میں اس طرح تحریر کیا ہے:

''بڑی بڑی آنکھیں، سینہ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا گنجینہ، دماغ لسانِ

نبوی ﷺ کا مرکز، بسطة في العلم والجسم کے صحیح مصداق''

پروفیسر عبدالقیوم کا بیان ہے:

''مولانا محمد سورتی لحیم و شحیم تھے۔ خوش قامت اور باوقار شخصیت کے مالک۔ گفتگو گھن گرج اور دبدبے سے کرتے۔ لباس سادہ مگر صاف ستھرا پہنتے۔ گرمیوں میں شلوار کرتا اور سردیوں میں اچکن کا اضافہ کر لیتے۔''

مولانا کے صاحب زادے عبدالرحمٰن طاہر سورتی لکھتے ہیں:

''محمد سورتی بڑا اعلیٰ قسم کا لباس پہنتے تھے۔ جامعہ ملّیہ میں کھاجی کا لباس پہننے کی قید تھی، لیکن وہ نہ پہنتے تھے۔ وہ گاندھی ٹوپی کے بجائے ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ لباس میں عطر وغیرہ لگانے کے شوقین تھے۔''

ان کے حلیے کے بارے میں ''یادوں کی دنیا'' کے صفحہ نمبر (161) میں یوسف حسین خاں رقم طراز ہیں:

''سر بڑا، بدن گداز اور ہاتھ پاؤں بھاری تھے۔ نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے۔ کھانے کھلانے کے بے حد شائق۔ عام طور پر شیروانی زیب تن کرتے، پاجامہ ٹخنوں سے اوپر رکھتے، سر پر عربوں جیسا رومال باندھتے، جس کا پلّو ایک طرف لٹکا ہوتا۔ سر منڈاتے اور لبیں ایسی باریک تراشی ہوئی ہوتیں کہ دور سے منڈی ہوئی معلوم ہوتیں۔ داڑھی شرعی یک مشت دو انگشت۔''

مولانا محمد سورتی نے ابتدائی تعلیم سورت میں حاصل کی۔ سات برس کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کیا۔ محمود عالم اور شیخ علی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مولوی عنایت اللہ، مولوی عبداللہ وغیرہ سے فارسی اور عربی پڑھی۔

اس کے بعد بمبئی گئے۔ وہاں ایک اہل حدیث امام مسجد مولوی محمد جعفر سے کسبِ فیض کیا۔ 1325ھ (1907ء) کو دہلی گئے۔ دہلی میں سید میاں نذیر حسین محدث کے مدرسہ (پھاٹک حبش خاں) میں رہائش رکھی۔ لیکن ان کے دہلی جانے سے قبل حضرت میاں صاحب وفات پاچکے تھے۔ اس مدرسے میں میاں صاحب کے پوتے مولانا سید عبدالسلام دہلوی کا درسِ حدیث طلباے علمِ حدیث کے لیے بڑی کشش رکھتا تھا۔ وہاں علامہ سورتی نے حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

پروفیسر محمد سرور جامعی مولانا سورتی سے روایت کرتے ہیں کہ

''ہم توکل بخدا دہلی کے ارادے سے گھر سے نکل پڑے، زادِ راہ ہمارے پاس صرف اللہ کا نام تھا۔ دہلی پہنچے تو ایک مدرسے میں جگہ مل گئی۔ ان دنوں کتابیں خریدنا ہماری بساط میں نہ تھا۔ ہم یہ کرتے کہ جس کتاب کی ضرورت پڑتی اس کی نقل کر لیتے۔ اس طرح اکثر کتابیں ہمیں زبانی یاد ہوجاتی تھیں۔ اس زمانے میں چاندنی چوک سے نہر بہتی تھی اور ریلوے اسٹیشن کے پاس کی زمین میں سایہ دار درخت کثرت سے تھے۔ ہم سارا سارا دن درختوں کے نیچے سایہ میں گزارتے۔ پڑھنے سے جی اکتاتا تو تیرنے چلے جاتے۔ چنانچہ تیرنے میں اتنی مہارت ہوگئی تھی کہ بھرے دریا میں تیرا کرتے تھے۔''

ان سطور کے راقم کو 1942ء میں گوجراں والا میں مولانا سورتی کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ بڑا سر، بھرا ہوا جسم، کھلے ہاتھ پاؤں، موٹی آنکھیں، سادہ مگر صاف ستھرا لباس۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی جامع مسجد چوک نیائیں میں تشریف فرما تھے۔ کئی اہل علم اس مجلس میں موجود تھے جو ان کی خالص علمی گفتگو سے محظوظ ہو رہے تھے۔

دہلی میں مولانا سورتی نے مختلف مدارس اور متعدد اساتذہ سے علومِ دینیہ کی تحصیل کی۔ مولانا عبدالسلام صاحب سے حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب بلوغ المرام پڑھی اور صرف ونحو کی بعض کتابیں مولانا محمد صاحب جونا گڑھی سے پڑھیں۔ مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی سے نحو کے کچھ اسباق پڑھے۔ اسی طرح مولانا عبدالوہاب دہلوی سے حدیثِ نبوی ﷺ کی بعض کتابوں کا درس لیا۔ شیخ ابواسماعیل یوسف حسین خان پوری سے الفیہ، سبعہ معلقات، عروض وقوافی کی تحصیل کی۔

بعد ازاں 1327ھ (1910ء) میں حیدرآباد (دکن) کے لیے رختِ سفر باندھا۔ وہاں شیخ علامہ ابوجلیل مکّی کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے۔ ایک سال وہاں قیام رہا تھا کہ اس کے بعد الغ کے استاذ شیخ طیب مکی رام پور کے لیے چلنے لگے تو مولانا سورتی بھی ان کے ساتھ وہاں جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ 1330ھ (1912ء) میں شیخ طیب ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادیب اول کے عہدے پر فائز ہوئے تو علم کے متلاشی مولانا محمد سورتی بھی وہاں چلے گئے۔ مولانا سورتی پانچ برس شیخ طیب مکّی کے ساتھ رہے۔ جب شیخ مکی واپس رام پور آگئے تو مولانا محمد سورتی بھی ان کے ہمراہ تھے۔

مولانا سورتی نے ان سے رام پور میں منطق، فلسفہ، ادب، اصول فقہ، علم کلام، تفسیر، صحیح بخاری وغیرہ بڑی کتابیں نہایت محنت سے پڑھیں۔ شیخ طیب مکّی سے تکمیل علم کے بعد مولانا سورتی نے مختلف جیّد علما سے ملاقاتیں کیں۔ پھر درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ اس عرصے میں انھوں نے شیخ حسین بن محسن انصاری سے ملاقات کی۔ اس کے بعد علامہ شمس الحق ڈیانوی سے خط کتابت کی۔ پھر دو فاضل شخصیتوں محمد شکرانی اور عبداللہ سیلانی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد ٹونک پہنچے۔ ان کا یہ سفر چند قلمی کتب کے مطالعے اور کتاب ''المستدرک'' وغیرہ نقل کرنے کے لیے تھا۔ وہاں یہ سعید عرفان کے ہاں مقیم رہے۔ 1332ھ سے 1335ھ (1914 سے 1917ء) تک کا عرصہ وہیں گزرا۔

مولانا سورتی مطالعے کے بے حد شائق تھے۔ عربی کے ہر قابل ذکر قدیم وجدید ذخیرے تک رسائی حاصل کرتے۔ عربی ادب کے علاوہ ان کا تاریخ، اسماء الرجال اور حدیث کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ جب کسی موضوع پر بحث کرتے معلومات کے دریا بہا دیتے۔ وہ عربی کے بے نظیر عالم اور محقق تھے اور عربی تصانیف کے بہترین نقاد بھی۔ وہ غیر معمولی حافظے کے مالک تھے۔ کسی کتاب پر ایک دفعہ نظر ڈال لیتے تو ازبر ہوجاتی۔ سید سلیمان ندوی نے ان کی وفات پر ماہنامہ ''معارف'' میں تحریر فرمایا تھا:

''مرحوم کا پایہ علم وادب، رجال وانساب واخبار میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جو کتاب دیکھ لیتے تھے وہ ان کے حافظے کی قید میں آجاتی تھی۔ سیکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار وانساب نوکِ زبان تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علما وادبا اور محدثین کی وسعتِ حافظہ کی جو عجیب وغریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں وہ یقیناً صحیح ہیں۔''[1]

مولانا عبدالغفار حسن مرحوم ومغفور نے بتایا کہ

''وہ عربی بولتے تو ان کا لہجہ بالکل عربوں جیسا ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بیت اللہ شریف میں تقریر کر رہے تھے اور عرب ان کی تقریر اور لہجے کے نکھار سے حیران ہو رہے تھے۔ بعض عرب اہل علم نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ آپ کا تعلق حجاز سے ہے یا یمن سے یا عرب کے کسی اور علاقے سے؟ انھیں یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ ہندوستانی ہیں۔''

مولانا محمد صاحب سورتی کی شادی حکیم سید سعید احمد صاحب کی صاحب زادی سے ہوئی تھی جو ہندوستان کے مشہور طبیب تھے۔ مولانا سورتی کی ساری زندگی تعلیم وتعلم

[1] ''معارف'' اعظم گڑھ، ستمبر 1942ء۔

اور درس و تدریس میں گزری۔ جن مدارس میں وہ پڑھاتے رہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

❁ جامعہ ملیّہ اسلامیہ: 29۔ اکتوبر 1920ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا افتتاح علی گڑھ میں مولانا محمود حسن صاحب نے کیا تھا۔ ابتدا ہی میں مولانا محمد سورتی اس کے مدرسین میں شامل ہو گئے۔ بعد میں جامعہ کو دہلی منتقل کر دیا گیا تھا۔ وہاں بھی ان کا سلسلہ تدریس جاری رہا۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ جامعہ ملیہ میں نہیں رہے۔

❁ جامعہ رحمانیہ بنارس: 1885ء میں حافظ عبدالرحیم، حافظ محمد ایوب، حافظ عبدالرحمٰن اور بعض دیگر حضرات نے ''مصباح الھدیٰ'' کے نام سے بنارس میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی۔ 1932ء میں اس مدرسے کو مولانا عبدالرحمٰن نے ذاتی مصارف سے بنارس کے محلّہ مدن پورہ کی عظیم الشان عمارت میں تبدیل کر کے اس کا نام ''جامعہ رحمانیہ'' رکھ دیا۔ یہاں جن باکمال اساتذہ نے تعلیم دینا شروع کی، ان میں مولانا محمد سورتی بھی شامل تھے۔ مولانا عبدالغفار حسن اور مولانا نذیر احمد رحمانی املوی بھی یہاں پڑھاتے رہے۔

❁ دارالحدیث رحمانیہ دہلی: یہ دارالحدیث 1921ء میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی تحریک سے قائم ہوا۔ اس کے بانی شیخ عبدالرحمٰن اور شیخ عطاء الرحمٰن دو بھائی تھے۔ یہی دونوں بھائی اس کے اخراجات کے ذمہ دار تھے۔ اس میں طلبا کے قیام و طعام کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ اس مدرسے میں کچھ عرصہ مولانا سورتی کا سلسلۂ تدریس جاری رہا۔

❁ جامعہ اعظم: دہلی کے محلّہ بلی ماراں میں عبدالحق تیزاب والے نے 1355ھ (1917ء) میں یہ مدرسہ قائم کیا تھا۔ اس مدرسے پر کئی دور آئے۔ یہاں مولانا محمد سورتی طلبا کو عربی اور انگلش کے اسباق پڑھاتے تھے۔

❁ دارالحدیث بمبئی: 1938ء میں یہ مدرسہ قائم ہوا۔ مولانا سورتی ایک مرتبہ

بمبئی تشریف لے گئے تو وہاں کے اہل حدیث حضرات نے ان سے یہیں رہنے کی درخواست کی۔ مولانا سورتی نے اس مدرسے میں درسِ قرآن وحدیث اور ادبِ عربی کی تعلیم دینا شروع کی۔ اس طرح انھوں نے مختلف اوقات میں پانچ یا چھ مدارس میں خدمتِ تدریس سرانجام دی۔

تعلیم وتعلم کے علاوہ مولانا ممدوح کو قلمی کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ پرانی کتابوں کی تلاش میں کتب خانوں کے چکر لگاتے رہتے تھے۔ اگر کہیں سے نادر چیزیں مل جاتیں تو انھیں خرید لیتے۔ دورانِ مطالعہ اس کی تصحیح بھی کرتے۔ بڑے بڑے سرکاری کتب خانے ان سے یہ نادر نسخے خریدتے تھے۔ مولانا کتابوں کے عاشق تھے اور انھیں حاصل کرنے میں بڑے مشاق۔! جو کتاب پسند آتی اسے خریدتے۔ اگر کسی وجہ سے نہ خرید سکتے تو اسے نقل کر لیتے۔ ٹونک میں کتابوں کی تلاش میں آئے تو یہیں ان کی شادی بھی ہوگئی۔ قلمی کتابوں کی فراہمی کے لیے وہ ٹونک، رام پور، پٹنہ، کلکتہ اور حیدر آباد (دکن) کے دور دراز شہروں کا سفر کرتے۔ حکیم اجمل خاں، مولانا سورتی کے ہم مکتب تھے۔ انہی کے ایما پر انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پروفیسری قبول فرمائی تھی۔

مولانا شرعی احکام کے سخت پابند تھے۔ ذرا سی بے راہ روی بھی ان کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ طلبا واساتذہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سب ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ مولانا کے عتاب پر ان سب کی گردنیں جھک جاتیں۔

مولانا اپنے شاگردوں کو جو سبق پڑھاتے، اسے بار بار یاد کراتے، یہاں تک کہ یہ سبق طلبا کے ذہن میں راسخ ہو جاتا۔

سید سلیمان ندوی، مولانا سورتی کے طریقۂ تعلیم کو ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

"انھیں عہد جاہلیت کے شعرا کا کلام سب سے زیادہ پسند تھا۔ جامعہ ملیہ

اسلامیہ علی گڑھ اور جامعہ رحمانیہ بنارس میں اپنی تدریسی سرگرمیوں کے فیوض عام کیے۔۔۔ ان کا ادب وشعر کا مذاق عہد حاضر کے مصری اور شامی اربابِ نقد سے بہت کچھ ملتا تھا۔‘‘

مولانا سورتی پڑھائی کے معاملے میں سختی تو ضرور کرتے تھے لیکن انھیں اپنے طلباء سے محبت بھی بہت تھی۔

ڈاکٹر علامہ اقبال کی علمی وفکری صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے، وہ بھی مولانا سورتی کی بے پناہ علمی قابلیت کے معترف تھے۔ جب انھیں اپنے انگریزی خطبات کے اردو ترجمے کا مسئلہ درپیش ہوا تو انھوں نے سید نذیر نیازی کے نام ایک خط لکھا:

’’سورتی صاحب سے مل لیجیے، وہ آپ کو تراجم کے متعلق بالخصوص اصطلاحات کے تراجم کے متعلق بہت مفید مشورے دیں گے۔‘‘

اس خط کے جواب میں سید نذیر نیازی نے اقبال کو لکھا:

’’میرا معمول تھا کہ خطبات کی اکثر عبارتیں علامہ محمد سورتی کو پڑھ کر سناتا۔‘‘[1]

پروفیسر عبدالقیوم کی روایت ہے:

’’مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا سورتی سے یہ خواہش ظاہر فرمائی کہ آپ شاہ ولی اللہ دہلوی کی ’’حجۃ اللہ البالغہ‘‘ کا اردو ترجمہ کریں۔ مولانا آزاد کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ حجۃ اللہ بڑے دقیق مسائل پر مشتمل ہے، اس لیے حجۃ اللہ کے اسلوب اور مسائل کی اہمیت کے پیش نظر مولانا سورتی کا علمی مقام اس بات کی ضمانت دے سکتا ہے کہ وہ اس اہم کتاب کا صحیح ترین اور قابلِ فہم ترجمہ کریں گے۔‘‘

بے شبہ مولانا سورتی اپنے وقت کے عظیم عالم دین، بہترین استاذ، علومِ دینیہ

---

[1] سید نذیر نیازی، مکتوباتِ اقبال (ص: 30)

کے ماہر اور عربی کے بہت بڑے ادیب تھے۔ مسلسل محنت کرتے کرتے آخری عمر میں مرضِ استسقا میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تقریباً ڈھائی سال اس مرض میں مبتلا رہے۔ اسی دوران میں ان کا ایک بیٹا عبداللہ عین جوانی میں انتقال کر گیا۔ اس صدمے نے مولانا کو نڈھال کر دیا تھا۔ چناں چہ وہ 23۔ شعبان المعظم 1361ھ بروز جمعۃ المبارک (7۔ اگست 1942ء) کو علی گڑھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علامہ محمد سورتی رحمہ اللہ کے سات بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ حضرت موصوف بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر لیتے تھے لیکن اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے میں نہایت سخت تھے۔ بیڑی، سگریٹ، فوٹو کھنچوانا، سونے کے بٹن اور ریشم کے کپڑے اور ریڈیو پر خرافات سننے کے سخت خلاف تھے۔

ان کے بے شمار شاگرد تھے۔ بعض شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں:

1. پروفیسر عبدالرحمٰن طاہر سورتی (مولانا کے بیٹے اور کئی کتابوں کے مصنف)
2. ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہندوستان)
3. ڈاکٹر عبدالعلیم (لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر، بعدہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر)
4. پروفیسر محمد سرور (ممتاز صحافی، بہت سی کتب کے مترجم اور مصنف)
5. مولانا عبدالصمد شرف الدین (ممتاز عالم دین)
6. رئیس احمد جعفری (ممتاز صحافی، بے شمار کتابوں کے مصنف ومترجم)
7. محمد بن احمد العمری (سعودی عرب میں بڑے عہدوں پر فائز رہے)
8. مولانا عبدالغفار حسن (ممتاز عالم اور سابق استاذ مدینہ یونیورسٹی)
9. ڈاکٹر سید عبداللہ (سابق چیرمین اردو دائرہ معارف اسلامیہ اور درجنوں کتب کے مصنف)

⑩ ملک حسن علی جامعی شرق پوری (بہت سی کتابوں کے مصنف و مترجم)
⑪ عبدالعزیز نجدی (مترجم قرآن مجید بہ زبان سندھی)

مولانا سورتی نے کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں بعض چھپ گئیں، بعض نہیں چھپ سکیں۔ انھوں نے علامہ عبدالعزیز میمن کی بعض تحریروں پر سخت تنقید کی، علامہ میمن نے بھی ان کو سخت لہجے میں جواب دیا۔ اس میں شاید معاصرت کا زیادہ عمل دخل تھا۔

2- علامہ عبدالمجید حریری بنارسی رحمہ اللہ

علامہ عبدالمجید حریری بنارسی 1892ء کو بنارس کے ایک متوسط علم دوست گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے بہت ذہین تھے۔ پانچ سال کے ہوئے تو مکتب میں بٹھائے گئے۔ نو سال کی عمر میں اردو، فارسی اور مبادیات عربی میں کافی مہارت پیدا کرلی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں درس نظامیہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ اسی عمر میں الٰہ آباد بورڈ کے ''ملا فاضل'' کے امتحان میں شریک ہوئے۔ ان کی کم عمری کی وجہ سے ان کے استاذ مولانا محمد منیر خاں اس امتحان میں ان کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

مولانا حریری اس امتحان میں پورے صوبہ یوپی میں (جو اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ تھا) اول پوزیشن میں کامیاب ہوئے۔ بورڈ نے انھیں انعام سے نوازا۔

انگریزی تعلیم کے لیے عبدالمجید حریری جے نرائن ہائی سکول بنارس کے امتحان میں شامل ہوئے اور اول پوزیشن حاصل کی۔ ایف اے بنارس ہندو یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ بی اے کرنے کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی سے ایم اے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تشریف لے گئے۔

جس دور میں خلافت کی تحریک عروج پر تھی، ان دنوں تحریک ترکِ موالات بھی چل رہی تھی۔ اسی دور میں انھوں نے علی گڑھ کو خیر باد کہا اور واپس اپنے وطن مالوف بنارس تشریف لے آئے۔ تحریک خلافت اور جنگ آزادی میں حصہ لیا اور اس سلسلے

میں ایک مرتبہ جیل بھی گئے۔ وہ ہمیشہ کانگرس کے ساتھ رہے۔ اخیر عمر میں سیاسی زندگی کو چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ ایل ایل بی پاس کرنے کے بعد وکالت شروع کی۔ وکالت خوب چلی، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد اس پیشے کو چھوڑ دیا، اس لیے کہ ''اس میں صبح سے شام تک جھوٹ، فریب، بے ایمانی اور دغابازی سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ پیشہ کسی شریف آدمی کے لیے مناسب نہیں۔'' یہ کہا اور اس پیشے سے دست بردار ہو گئے۔ علامہ عبدالمجید حریری مطالعہ کتب کے بہت شائق تھے۔ رات دن مطالعے میں مصروف رہتے۔ اپنے ذاتی کتب خانے میں انھوں نے اپنے ذوق کی بہت سی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ اب یہ کتب خانہ مرکزی دارالعلوم بنارس کی ملکیت میں ہے، جس سے طلبا، اساتذہ اور عام اہل علم استفادہ کرتے ہیں۔ مولانا حریری نے وفات سے تین برس قبل کتب خانہ دارالعلوم بنارس کے حوالے کر دیا تھا۔

مولانا مسعود عالم ندوی نے جب اپنی کتابیں ''محمد بن عبدالوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح'' اور ''ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک'' تالیف کیں تو انھوں نے اس کتب خانے سے بہت استفادہ کیا۔

مولانا عبدالمجید حریری بڑے مہمان نواز تھے اور انھیں اہلِ علم کے مرجع کی حیثیت حاصل تھی۔ بیرون ملک اور اندرون ملک سے جب کوئی عالم بنارس تشریف لاتے تو وہ مولانا عبدالمجید حریری کے مہمان ہوتے۔ مولانا ابو الکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، مولانا محمد سورتی، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا مسعود عالم ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) رفیع احمد قدوائی اور ملک کے دیگر اعیان و اکابر کے ساتھ مولانا حریری کے گہرے تعلقات تھے۔

آزادیِ وطن کے بعد جب مولانا ابو الکلام آزاد نے مدارس عربیہ کے نصابِ تعلیم میں اصلاح و ترمیم کی غرض سے ایک کمیٹی تشکیل دی تو مولانا عبدالمجید حریری کو

اس کے رکن مقرر کیا۔ مولانا آزاد سے ان کا تعلق سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے تھا۔ مولانا آزاد کو مولانا حریری کے علم وادب اور لغت میں مہارت پر بڑا اعتماد تھا۔ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبیداللہ سندھی جب بھی بنارس آئے، انھوں نے مولانا حریری ہی کے ہاں قیام فرمایا۔

مولانا عبدالمجید حریری کو سات زبانوں پر عبور حاصل تھا اور وہ سات زبانیں ہیں: اردو، عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، روسی، ترکی۔ ان میں سے ہر زبان میں گفتگو کرنے کے ماہر ہونے کے ساتھ ہر اہل زبان کے لہجے میں بات کرتے تھے۔ انگریزی بولتے تو انگریزی لہجہ اور عربی بولتے تو ایسے معلوم ہوتا کہ خالص عرب کے باشندے ہیں۔ فارسی میں گفتگو فرماتے تو فارسی کے بہت بڑے ایرانی عالم وادیب معلوم ہوتے۔ عربی بولتے بھی خوب تھے اور لکھنے پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ سید سلیمان ندوی نے ایک دفعہ مولانا سے کہا کہ ”عربی زبان وادب پر آپ کو جو قدرت ومہارت حاصل ہے، اب تک میں اس مقام تک نہیں پہنچ سکا۔“

ملک شام کے ایک جید عالم شیخ عبدالعزیز ثعالبی ایک دفعہ سیاحت کی غرض سے ہندوستان تشریف لائے تو بنارس میں مولانا حریری کے ہاں ان کا قیام رہا۔ وہ مولانا حریری سے بڑے متاثر ہوئے۔ انھیں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ عرب عالم ہیں یا ہندوستانی۔ انھوں نے مولانا حریری سے سوال کیا کہ آپ نے جامعہ ازہر (مصر) میں کتنا عرصہ پڑھا؟

مولانا حریری نے فرمایا: میں مصر پڑھنے کی غرض سے نہیں گیا۔ میں نے ساری عربی تعلیم اپنے ہی وطن میں حاصل کی ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ہندوستان سے باہر قدم نہیں نکالا۔ علامہ ثعالبی فرمانے لگے آپ کی زبان اور لہجے سے محسوس یہ ہو رہا

ہے کہ آپ نے ہندوستان میں کسی تجارتی سلسلے میں رہائش رکھی ہے لیکن آپ ہیں عرب باشندے۔!

مولانا حریری عربی اس قدر شستہ زبان میں بول رہے تھے کہ علامہ ثعالبی کو ان کے ہندوستانی نہ ہونے اور عرب ہونے کا واہمہ سا ہوگیا۔ علامہ حریری کے استاذ علامہ محمد منیر خاں نے جب علامہ ثعالبی کو یقین دلایا کہ یہ میرے شاگرد ہیں اور انھوں نے ساری عربی تعلیم مجھ سے حاصل کی ہے تو علامہ ثعالبی کو یقین کرنا پڑا۔

علامہ ثعالبی نے اپنی جوہر شناسی اور علم دوستی کی بنا پر مولانا حریری کو فرمایا کہ میرے ایک عرب دوست ہیں جو عربی ادب ولغت پر عمیق نظر رکھتے ہیں، اس وقت وہ غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو انھیں آپ کے پاس بھیج دوں۔ یہ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی تھے۔ مولانا حریری نے بڑی مسرت کے ساتھ یہ پیش کش قبول فرمائی اور علامہ ثعالبی سے بہ اصرار فرمایا کہ انھیں ضرور میرے پاس بنارس بھیج دیں۔ چناں چہ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی بنارس تشریف لے آئے اور دو سال حریری صاحب کے پاس مہمان کی حیثیت سے رہے۔ علامہ حریری نے ان کی بڑی مہمان نوازی کی اور بڑی محبت کا برتاؤ کیا۔ دونوں میں علمی مذاکرے ہوتے، علمی وادبی، نحوی اور لغوی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ مولانا حریری نے عربی گفتگو میں علامہ تقی الدین ہلالی کی بہ صورت مشق بڑی مدد کی۔

علامہ ہلالی نے مولانا حریری کے متعلق فرمایا کہ ''وہ ایک ادیب ومحقق ہیں، ان کا علم، علمِ لدنی بھی ہے اور وہبی بھی ہے۔''

سید سلیمان ندوی کے علم میں جب یہ بات آئی کہ علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی، مولانا عبدالمجید حریری رحمہ اللہ کے مہمان ہیں تو انھوں نے انھیں لکھا کہ علامہ ہلالی کو عربی تدریس کے لیے دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ) بھیج دیں۔ علامہ ہلالی ایک راسخ العقیدہ سلفی

عالم تھے، اس لیے انھوں نے ندوہ جانا پسند نہ کیا کہ شاید وہاں میری کسی سے نبھ نہ سکے، لیکن مولانا حریری کے اصرار پر وہ عربی زبان کی تدریس کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لے گئے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر علامہ ہلالی مراکشی ندوہ نہ تشریف لے جاتے تو مولانا مسعود عالم ندوی اور سید ابوالحسن علی ندوی کا اتنا نام اور کام نہ ہوتا۔ یہ مولانا عبدالمجید حریری کا اہل ندوہ پر احسان ہے لیکن اس مادی دنیا میں اس قسم کے احسان کو کون یاد رکھتا ہے؟ جن لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، وہ عرصہ گزرا دنیا سے رخصت ہو گئے اور معاملہ ختم ہو گیا۔

علامہ حریری جب تک زندہ رہے، علامہ ہلالی تعطیلات کے ایام بنارس میں گزارتے۔

علامہ موسیٰ جار اللہ روسی، انقلابِ روس کے بعد جلا وطن ہوئے تو وہ بنارس میں مولانا عبدالمجید حریری کے مہمان رہے۔ مولانا حریری نے ان سے ترکی زبان سیکھی۔ مولانا محمد سورتی جب مولانا حریری کو خط لکھتے تو "الفاضل المجيد و الظريف الوحيد الأستاذ" اور جب علامہ موسیٰ جار اللہ انھیں خط لکھتے تو انھیں "الأديب المجيد" جیسے الفاظ سے خطاب فرماتے۔

مولانا حریری بلند بانگ خطیب اور خوش بیان مقرر بھی تھے۔ تقریر کرتے تو خوب صورت الفاظ ان کی زبان سے نکلتے۔ عربی کے علاوہ ان کی اردو تحریر و تقریر بہت عمدہ تھی، کیوں کہ یہ ان کی مادری زبان تھی۔ فارسی اور عربی کے ہزاروں اشعار ان کے نوک زبان تھے۔ مناسب مواقع پر اشعار اپنی تقریروں میں استعمال فرماتے۔ بے شک وہ ایک عبقری انسان تھے۔

1949ء میں حکومتِ ہند نے مولانا عبدالمجید حریری کو جدّہ میں ہندوستان کا کونسلر مقرر کیا۔ مولانا براستہ مصر، جدہ گئے اور دو دن مصر میں ٹھہرے۔ وہاں کے

علمائے کرام اور مشائخ سے مذاکرات کیے۔ ازہر کے شیخ الجامعہ شیخ احمد المامون الشناوی سے ملے اوران سے باتیں ہوئیں۔ معروف مصری استاذ شیخ علی مصطفیٰ الغرابی سے بھی ملاقات کی۔

جدہ جانے کے بعد علامہ حریری مدینہ منورہ گئے۔ مدینہ منورہ کے ایک بازار میں کھڑے تھے۔ پتا چلا کہ یہاں سے مفتی اعظم فلسطین علامہ سید امین الحسینی گزر رہے ہیں۔ انھوں نے حریری صاحب کو پہچان لیا۔ مفتی اعظم شاہی مہمان تھے، وہ مولانا کو بھی اپنے ساتھ اپنی قیام گاہ پر لے گئے۔ وہاں عرب ممالک سے آئے ہوئے بہت سے علما وفضلا کا مجمع تھا۔ یہ سب مولانا حریری کی تھوڑی سی گفتگو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کی جلالت علمی کا اعتراف کرنے لگے۔

شاہ سعود اس وقت حاکمِ حجاز تھے۔ ان کی دعوت پر مولانا حریری ریاض تشریف لے گئے۔ حریری صاحب نے شاہ سعود کے فرمان پر ان کا شاہی کتب خانہ مرتب کیا۔ جب مولانا حریری کتب خانے کی ترتیب وتنظیم سے فارغ ہوئے تو ان کے اعزاز میں شاہ سعود کی طرف سے ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ وزراء، مشیر اور عمائدِ شہر اس جلسے میں شریک ہوئے۔ جب مولانا نے اس کتب خانے کے انتظام کے متعلق بتایا تو ہر طرف سے ”أحسنت مرحبا“ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

علامہ عبدالمجید حریری نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ البتہ بنارس کے ایک مفتی (جو حنفی عالم تھے) کے جواب میں بنارس کے اہل حدیث عالم دین مولانا عبدالمتین صاحب کے تحریر کردہ رسالے ”نماز جنازہ اندرون مسجد“ پر ایک مبسوط علمی تقریظ لکھی تھی۔ اس کے علاوہ 1928ء میں منعقدہ ”مومن کانفرنس“ کی صدارت فرمائی۔ اس کے بعد 1939ء میں اسی جماعت کی کانفرنس کی صدارت کلکتہ میں فرمائی۔ 1940ء میں انھوں نے یوپی آزاد مسلم کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں خطبہ صدارت پڑھا۔ یہ تینوں کانفرنسوں کے صدارتی خطبے

اردو میں ہیں جو کسی زمانے میں چھپے بھی تھے۔ ان خطبات کی زبان بڑی معیاری اور انشا پردازی کے اصولوں کے عین مطابق ہے، جسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

علامہ حریری نے عربی زبان میں ایک چھوٹا سا رسالہ ''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے منصرف اور غیر منصرف'' ہونے پر لکھا تھا۔ ایک رسالہ بہ زبان عربی ''خلافت علیٰ منہاج النبوۃ'' کے موضوع پر تحریر کیا تھا۔

مولانا عبدالمجید حریری ابتدا ہی سے عبادت و زہد کی طرف مائل تھے اور اس موضوع کی کتابوں کا مطالعہ ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ زیادہ وقت اوراد و وظائف، اذکارِ الٰہی اور تلاوتِ کلام پاک میں گزرتا۔ اخیر عمر میں گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک اپنے آپ کو محدود کر لیا تھا۔

دسمبر 1972ء میں علم وادب کے یہ نیّر تاباں جو علامہ عبدالمجید حریری کے نام سے موسوم تھے، 80 سال کی عمر پا کر اس دارِ فانی سے دارِ بقا کی طرف کوچ فرما گئے۔ اللھم اغفرلہ و ارحمہ.

3- علامہ عبدالعزیز میمن

علامہ عبدالعزیز میمن کی ولادت اکتوبر 1888ء (محرم 1306ھ) کو موضع راجکوٹ (گجرات، ہندوستان) میں ہوئی۔ ان کے آبا و اجداد بردولی (کاٹھیاوار) سے تعلق رکھتے تھے جو کسی زمانے میں صوبہ سندھ سے نقل مکانی کر کے وہاں آباد ہوئے تھے۔ یہ تجارت پیشہ خاندان تھا۔

عبدالعزیز میمن نے تعلیم کا آغاز اپنے مسکن راجکوٹ میں کیا۔ قرآن شریف ناظرہ ختم کرنے اور اردو کی چند کتابیں پڑھنے کے بعد والد مکرم نے بیٹے کو جونا گڑھ بھیج دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف سات سال کی تھی۔ پھر والد کے کہنے پر واپس راجکوٹ چلے گئے۔

والد صاحب تجارت پیشہ ہونے کے ساتھ خالص مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ وہ بیٹے کو دینی تعلیم دلانے کے شائق تھے۔ دہلی کو اس وقت علم اور علما کے بہت بڑے مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہاں دینی تعلیم کے متعدد مدرسے جاری تھے، جن میں مشہور وممتاز علماے کرام خدمتِ تدریس سرانجام دے رہے تھے، چنانچہ والد نے بیٹے کو دہلی بھیج دیا۔ یہ اواخر دسمبر 1901ء کی بات ہے۔ اس وقت میمن صاحب تیرہ سال کی عمر کو پہنچے تھے۔ وہاں انھوں نے عربی اور فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ نیز صرف ونحو کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تکمیل کی۔ حدیث کی مشکوٰۃ شریف بھی وہیں پڑھی۔ ان کے اس دور کے اساتذہ میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد بشیر سہسوانی اور مولانا عبدالوہاب دہلوی کے اسماے گرامی قابلِ تذکرہ ہیں۔

مولانا سہسوانی سے انھوں نے تفسیر وحدیث کے علوم حاصل کیے اور بعض دیگر علوم کی کتابیں بھی پڑھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد سے عربی ادبیات میں سے حماسہ، ابوتمام، دیوان متنبّی، مقاماتِ حریری اور المعری کی سقط الزند باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھیں۔ اپنے ان دونوں اساتذہ سے وہ بے حد متاثر تھے اور ان کے علم وفضل کے انتہائی مداح۔ 1326ھ (1908ء) میں مولانا سہسوانی فوت ہوئے تو لائق شاگرد نے جلیل القدر استاذ کی وفات پر عربی میں دردناک مرثیہ لکھا۔

میمن صاحب نہایت ذہین اور حصولِ علم میں انتہائی تیز تھے۔ انھوں نے 1911ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور 1913ء میں مولوی فاضل کے امتحانات دیے اور اول پوزیشن حاصل کی۔ منشی فاضل اس زمانے میں فاضل فارسی کو کہا جاتا تھا اور مولوی فاضل کا اطلاق فاضل عربی پر ہوتا تھا۔

درسیات کی تکمیل کے بعد ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا۔ ان کی ذہانت اور کثرت

معلومات کی شہرت تقریباً ملک کے تمام تدریسی اداروں میں پہنچ گئی تھی۔ 1913ء میں ان کی نصابی تعلیم کی تکمیل ہوئی تو اسی سال انھیں ایڈورڈ مشن کالج پشاور میں عربی اور فارسی کے استاذ مقرر کر لیا گیا۔

1920ء میں وہ پشاور سے پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج لاہور چلے گئے۔ یہاں انھیں مولوی محمد شفیع، مولوی نجم الدین، سید محمد طلحہ، سید اولاد حسین شاداں بلگرامی اور دیگر متعدد نامور اصحاب علم کی رفاقت میسر آئی۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خاں مقرر ہوئے تو انھوں نے ان کو اپنے ہاں بلا لیا۔ یہ نومبر 1925ء کی بات ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں انھیں شعبہ عربی کے ریڈر مقرر کیا گیا۔ بعد ازاں یونیورسٹی کے صدر شعبہ عربی بنا دیے گئے۔ دسمبر 1943ء میں بہ طور پروفیسر ان کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اس منصب پر وہ مارچ 1949ء تک فائز رہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ اس سے قبل مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر جرمنی یا انگلستان کے کسی مستشرق کو بنایا جاتا تھا، علامہ عبدالعزیز میمن پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس عہدے پر فائز کیا گیا۔

جب مارچ 1949ء میں ان کی مدتِ صدارت ختم ہوئی اس وقت مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے (جو اس سے کئی سال بعد ہندوستان کے صدر منتخب کیے گئے) انھوں نے علامہ میمن کی مدتِ ملازمت ایک سال بڑھا دی۔ اس طرح وہ 31۔ مارچ 1950ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی کے عہدۂ صدارت سے سبک دوش ہوئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تدریسی ذمہ داریوں سے فراغت کے بعد علامہ عبدالعزیز میمن چار پانچ سال وہیں رہے۔ پھر اپنے اعزہ واقارب سے ملاقات کے لیے کراچی تشریف لے گئے۔ کراچی میں ان کے بہت سے قدردان اور شاگرد موجود

تھے، جن میں ممتاز حسن، ڈاکٹر سید محمد یوسف، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور پاکستان میں مصر کے سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے اصرار کیا کہ وہ کراچی رہیں اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر شپ کا عہدہ قبول فرمالیں۔ لیکن کراچی کی آب و ہوا ان کے موافق نہ تھی اور یہاں کے حکومتی حالات سے بھی وہ مطمئن نہ تھے، تاہم یہ ایک علمی کام تھا جو ان کے ذہن کے مطابق تھا، اس لیے رضامند ہوگئے۔ لیکن ادھر ہندوستان میں بھی ان کا بڑا مقام تھا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے پچیس سال خدمات سرانجام دی تھیں۔ ان کے وہاں بے شمار شاگرد اور قدردان تھے۔ علی گڑھ میں ''میمن منزل'' کے نام سے ان کی کوٹھی بھی تھی۔ وہ کراچی سے علی گڑھ گئے، وہاں کے معاملات درست کیے اور واپس کراچی آگئے۔ کراچی میں جو کام ان کے سپرد کیا جا رہا تھا، وہ ان کے ذوق کے ہم آہنگ خالص علمی اور تحقیقی کام تھا۔ انھوں نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ڈائریکٹر شپ کا عہدہ سنبھال لیا۔ مارچ 1959ء میں انھیں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر اور صدر بھی مقرر کر دیا گیا۔

اب وہ 72 سال کی عمر کو پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ جون 1960ء میں ڈاکٹر اشتیاق حسین کے ڈائریکٹر مقرر ہونے کے بعد انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کی ذمہ داریوں سے علاحدگی اختیار کر لی۔

بعدازاں 1964ء میں پروفیسر حمید احمد خاں پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے تو ان کے اصرار پر وہ لاہور آگئے اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کی زمام صدارت ہاتھ میں لی۔ لیکن اس منصب پر وہ دو سال فائز رہے۔ 1966ء میں کراچی تشریف لے گئے۔

علامہ عبدالعزیز میمن نے 1913ء میں ایڈورڈ مشن کالج پشاور سے تدریسی

خدمات کا آغاز کیا تھا جو طویل عرصے تک جاری رہا اور ہزاروں اصحابِ علم نے ان سے استفادہ کیا۔ ان میں سے بے شمار لوگ پاکستان وہندوستان کی حکومتوں کے اہم مناصب پر فائز رہے۔ ان کے پشاور کے شاگردوں کی فہرست میں سردار عبدالرب نشتر، ارباب محمد عباس، مہر چند کھنہ، خان عبدالغفار خان کے بھانجے محمد یونس خاں کے نام شامل ہیں۔ اورینٹل کالج لاہور کے فیض یافتگان میں سے مولانا امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی شامل ہیں۔ علی گڑھ میں ان سے لاتعداد شاگردوں نے استفادہ کیا۔ وہ اپنے عہد کے رفیع القدر معلم تھے۔ طلبا ان سے ہمیشہ مطمئن رہے اور انھوں نے طلبا کی علمی تربیت کو اپنا بنیادی فریضہ قرار دیے رکھا۔

اب آیے میمن صاحب کی تصنیفی اور تحقیقی تگ وتاز کی طرف۔!

علامہ عبدالعزیز میمن کی مطبوعہ تصانیف کی تعداد تیس سے زیادہ ہے۔ ان میں سے چند کتابوں کا ذیل میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

① **إقليد الخزانة:** گیارھویں صدی ہجری کے معروف عالم شیخ عبدالعزیز بغدادی نے ”خزانة الأدب ولب لباب لسان العرب“ کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو ایک ضخیم کتاب ہے اور اہم ترین معلومات کا خوب صورت مجموعہ۔! علامہ عبدالعزیز میمن نے اس کتاب کو ایڈٹ کیا، اس میں کچھ ضروری اضافے کیے اور اسے ”إقليد الخزانة“ کے نام سے شائع کیا۔

② **سمط اللآلي في شرح أمالي القالي:** اندلس کے حاکم عبدالعزیز الناصر (300۔ 350ھ) نے ایک نامور اہل علم ابوعلی القالی کو اپنے بیٹے ”الحکم“ کا اتالیق مقرر کیا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگرد الحکم کو املا کی شکل میں تعلیم دی۔ بعد میں ان امالی کو کتابی صورت دے کر اس کا نام ”الأمالي لأبي علي القالي“ رکھا۔ علامہ میمن نے بڑی تحقیق وتدقیق سے اس کی تدوین

وتنقیح فرمائی اور اسے "سمط اللآلي في شرح أمالي القالي" کے نام سے شائع کیا۔

③ **الحماسة الصغریٰ:** ابوتمام کی معروف کتاب "الحماسة" درسی حلقوں میں بڑی متعارف ہے جو بہت سے اشعار کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب صدیوں سے مدارس دینیہ میں پڑھائی جارہی ہے۔ لیکن اس کی بعض خامیوں کو دور کرنے کی کسی نے کوشش نہیں کی۔ علامہ عبدالعزیز میمن نے اس کے تمام شعراء کے حالات لکھے، اشعار کے سیاق وسباق کی وضاحت کی۔ جن دواوین سے جو اشعار منتخب کیے گئے تھے، ان کی نشان دہی کی۔ ہر مؤلف کے حالات قلم بند کیے اور پھر "الحماسة الصغریٰ" کے نام سے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

④ **أبو العلاء وأماليه:** ابو العلا المعری (353ـ449ھ) عربی ادب کی معروف شخصیت تھے۔ مصر کے نامور نابینا ادیب طٰہٰ حسین نے ایک کتاب "ذکریٰ أبي العلاء" کے نام سے شائع کرائی جو ان کی اہم تحقیقات پر مبنی ہے۔ علامہ عبدالعزیز میمن نے اس پر ایسا تحقیقی وتنقیدی کام کیا اور ایسی علمی بحثیں کیں، جن سے طٰہٰ حسین کی کتاب عاری ہے۔ دونوں اہل علم کے تحقیقی معیار اور معلومات میں بڑا فرق ہے۔

⑤ **دیوان حمید بن ثور:** یہ حمید بن ثور کے ان اشعار کا مجموعہ ہے جو مختلف مقامات میں بکھرے ہوئے تھے۔ میمن صاحب نے انھیں یک جا کیا اور ان پر مفید حواشی لکھے۔ پھر اسے دیوان حمید بن ثور کے نام سے شائع کیا۔

⑥ **دیوان سحیم عبد بن الحسحاس:** یہ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ ان کے اشعار مختلف جگہوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ علامہ میمن نے انھیں جمع کیا اور ان پر ضروری حواشی تحریر کیے۔

⑦ **كتاب التنبيهات على أغاليط الرواة:** یہ علی بن حمزہ مصری کی تصنیف ہے، جو عباسی دور کے معروف شاعر متنبّی (303۔ 353ھ) کا دوست تھا۔ میمن صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا اوراس پر بہترین حواشی لکھے اور اسے بہت سی معلومات کے ساتھ شائع کیا۔

⑧ **كتاب المنصوص والممدود:** یہ علم نحو کے مشہور عالم فراء کی تصنیف ہے جو نایاب تھی۔ علامہ میمن نے اسے مرتب کر کے مکتبہ دارالمعارف مصر سے شائع کرایا۔

⑨ **لسان العرب:** یہ معروف امام لغت ابن منظور افریقی کی تصنیف ہے، جس کی تحقیق وترتیب میں علامہ عبدالعزیز میمن نے بے حد محنت کی۔ کتاب قدیم طرز کی ہے، اس لیے انھوں نے اس کے استعمال کے لیے رہنما اصول وضع کیے، ضروری حواشی لکھے۔ مشکل الفاظ کو حل کیا اور دوسرے مصادر عربی سے انھیں مربوط کیا۔ یہ علامہ ممدوح کا بہت بڑا علمی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔

علامہ ممدوح کا حافظہ بے حد مضبوط تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں مختلف شاعروں کے کم وبیش ایک لاکھ اشعار زبانی یاد تھے۔ انھوں نے بہت سے عرب اور غیر عرب ملکوں کے مطالعاتی دورے کیے۔ ان کا حلقۂ تعارف بہت وسیع تھا۔ وہ جہاں جاتے بے حد احترام سے ان کا استقبال کیا جاتا۔

عقیدے کے لحاظ سے میمن صاحب سلفی تھے۔ان کی ابتدائی زمانے کی تحریرات پر ان کا نام عبدالعزیز السّلفی الاثری لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ باعمل اہل حدیث تھے۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی کی علمی و دینی تقریروں اور ان کی صحبتوں سے ان کے عقیدے میں مزید استحکام پیدا ہوگیا تھا۔

میمن صاحب کو اپنے لائق شاگردوں سے انتہا درجے کی محبت تھی اور ان کی ترقی

سے راحت محسوس کرتے تھے۔

ان کے قیامِ لاہور کے زمانے میں ان سطور کے راقم کی ان سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی۔ طویل قامت، گورے چٹے، چھریرا بدن، چھوٹی سفید ڈاڑھی، سفید قمیص، پاجامہ اور شیروانی ان کا لباس تھا۔ سر پر جناح کیپ رکھتے۔ لوہاری دروازے کے باہر مسلم مسجد کے نیچے مولوی شمس الدین تاجر کتب کی دکان تھی۔ تین چار بجے کے بعد نئی اور پرانی کتابوں کے بہت سے شوقین وہاں آتے تھے اور خوب محفل جمتی تھی۔ علامہ عبدالعزیز میمن بھی اکثر وہاں تشریف لاتے اور سب لوگ بڑی توجہ سے ان کی باتیں سنتے۔

اس سراپا علم وتحقیق نے جسے علامہ عبدالعزیز میمن کہا جاتا تھا، 26۔ ذوالقعدہ 1398ھ (27۔ اکتوبر 1978ء) کو 90 برس کی عمر پاکر کراچی میں وفات پائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

❁❁❁❁❁

ساتواں باب

اردو سے عربی تراجم کی چند مثالیں

برصغیر کے بے شمار اصحابِ علم نے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں۔ بہت سی عربی، فارسی، انگریزی زبانوں کی کتابوں کے اردو ترجمے کیے۔ فقہی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان اصحابِ علم میں حنفی بھی شامل ہیں اور اہل حدیث بھی، لیکن یہاں فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ ماضی قریب یا زمانۂ حال میں کون کون سی اردو کتابوں کو برصغیر کے کن اہل حدیث اصحابِ علم نے عربی زبان میں منتقل کیا۔ پہلے تذکروں کی طرح یہ تذکرہ بھی مختصر الفاظ میں کیا جائے گا۔ تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

ڈاکٹر صاحب موصوف کی ولادت 18۔ اگست 1939ء (22۔ جمادی الاخری 1358ھ) کو ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر مؤناتھ بھنجن میں ہوئی۔ وادیِ ہوش میں قدم رکھا تو حصولِ علم کی راہ پر گام زن ہوگئے۔ اس طویل سفر کی بڑی کامیابی کے ساتھ قابلِ رشک منزلیں طے کیں۔ پھر اپنے آپ کو تدریس وتصنیف کے حوالے کردیا اور شان دار کارنامے سرانجام دیے۔ اس کی تفصیل یہ فقیر اپنی ایک کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں بیان کرچکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو اور فارسی کی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ان کتابوں میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں:

- قرة العينين في تفضيل الشيخين (از شاہ ولی اللہ محدث دہلوی)
- الإكسير في أصول التفسير (از نواب صدیق حسن خان)

- رحمة للعالمین (از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری) تین جلد۔
- تحریک آزادیِ فکر اور شاہ ولی اللہ کی مساعیِ جمیلہ (از مولانا محمد اسماعیل سلفی)
- مسئلہ حیات النبی ﷺ (مولانا محمد اسماعیل سلفی)
- زیارتِ قبور (مولانا محمد اسماعیل سلفی)
- حجیتِ حدیث (مولانا محمد اسماعیل سلفی)
- جماعت مجاہدین (از مولانا غلام رسول مہر)

ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی، شیخ محمد تقی امینی، علامہ مصلح الدین اعظمی کی بعض کتابوں کے عربی ترجمے کیے۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کثیر الدرس، کثیر التصانیف اور وسیع المطالعہ عالم تھے۔ انھوں نے جہاں اردو اور فارسی کی متعدد کتابوں کو عربی میں منتقل کیا، وہاں عربی کی بعض اہم کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ انگریزی اور ہندی میں ان کے مضامین اور کتابوں پر مقدموں کے ترجمے ہوئے۔ اس طرح ان سے عربی، اردو، ہندی، انگریزی چار زبانوں میں لوگوں نے استفادہ کیا۔ اور یہ چاروں زبانیں ان کے ملک ہندوستان میں رواج پذیر ہیں۔ ہندی ان کی سرکاری زبان ہے ۔ اردو کو بھی کسی حد تک سرکاری حیثیت حاصل ہے اور یہ عام باہمی رابطے کی زبان بھی ہے۔ انگریزی کا بھی وہاں چلن ہے۔ عربی وہاں کے علما اور اہل مدارس کی بنیادی ضرورت ہے اور عربوں کو برصغیر کے اصحابِ علم کی علمی تگ وتاز سے متعارف کرانے کے لیے بھی اردو کی بہت سی کتابوں کا عربی میں منتقل کرنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری نے 30۔ اکتوبر 2009ء (10۔ ذیقعدہ 1430ھ) کو وفات پائی۔[1]

---

[1] ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب: گلستانِ حدیث (ص: 385 تا 395)

ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی

ڈاکٹر صاحب ممدوح کا شمار ہندوستان کے نامور محققین میں ہوتا ہے۔ وہ یکم جنوری 1948ء کو ہندوستان کے صوبہ یو پی کے ضلع سدھارتھ نگر کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور کئی دینی اداروں میں اپنے دور کے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل، پھر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور اُردو کی دو نہایت اہم تاریخی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔

ان میں ایک کتاب "سيرة البخاري" ہے جو حضرت مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ یہ کتاب ہندوستان میں بھی چھپی اور پاکستان میں بھی۔ برصغیر کے اہل علم میں اسے بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی نے اسے عربی کے قالب میں ڈھالا اور اس کے بہت سے مقامات پر حواشی لکھے، جن کی وجہ سے معلومات میں اتنا اضافہ ہوا کہ کتاب دو جلدوں میں پھیل گئی۔ یہ عربی کتاب 1423ھ میں مکہ مکرمہ میں طبع ہوئی۔[1]

دوسری اردو کتاب مولانا مسعود عالم ندوی کی ہے جس میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی کے سوانح حیات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا نام ہے "محمد بن عبدالوہاب... ایک مظلوم اور بدنام مصلح" ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کا عربی ترجمہ "محمد بن عبدالوهاب... مصلح مظلوم ومفتریٰ عليه" کے نام سے کیا۔ اس میں بھی بہت سے اضافے کیے گئے ہیں۔ اضافوں کی وجہ سے کتاب نے بڑی اہمیت اختیار کی اور سعودی عرب میں متعدد مرتبہ چھپی۔ اہل علم بڑے شوق سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

---

[1] مولانا عبدالسلام مبارک پوری کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب: "گلستانِ حدیث" (ص: 145 تا 149) اور ڈاکٹر عبدالعلیم بستوی کے لیے دیکھیے میری کتاب: "دبستانِ حدیث" (از ص: 619 تا 622) شائع کردہ مکتبہ قدوسیہ اردو بازار، لاہور۔

مولانا صلاح الدین مقبول احمد:

ہمارے دوست مولانا صلاح الدین بن حاجی مقبول احمد 15۔جنوری 1956ء کو موضع اونرہوا ضلع بلرام پور (صوبہ یوپی ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مدرسہ نورالہدیٰ میں حاصل کی۔ پھر حصولِ علم کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہوا مدینہ یونیورسٹی تک پہنچا۔ وہاں انھوں نے جن جلیل القدر اساتذہ سے اخذ فیض کیا، ان میں سعودی عرب، مصر، سوڈان، ہندوستان اور پاکستان کے رفیع المنزلت اساتذہ شامل ہیں۔ بعدازاں 17۔فروری 1982ء کو وہ کویت چلے گئے۔ اب بھی وہیں ہیں۔ انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ہندوستان، کویت اور سعودی عرب کے حلقۂ اہل علم میں انھیں بے حد اعزاز کا مقام حاصل ہے۔ انھوں نے حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کی اردو کتاب ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' کا ''موقف الجماعة الإسلامية من الحديث'' کے نام سے اور رسالہ ''مسلکِ امام بخاری'' کا ''مذهب الإمام البخاري في ضوء صحيحه'' کے نام سے عربی ترجمہ کیا۔ مولانا سلفی کی بعض اور کتابوں کو بھی وہ اردو کے قالب میں ڈھال رہے ہیں۔

مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کی ایک اردو کتاب کو بھی انھوں نے عربی میں منتقل کیا۔ وہ تحریر و تصنیف میں ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔[1]

مولانا محمد عزیر شمس

مولانا محمد عزیر شمس مذکورہ تینوں حضرات سے عمر میں چھوٹے ہیں۔ 1957ء میں موضع بنکٹوا ضلع مدھوبنی (صوبہ بہار، ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی

---

[1] مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں کیا۔ (از ص: 167 تا 170) اور مولانا صلاح الدین مقبول احمد کے واقعاتِ زندگی کے لیے دیکھیے میری کتاب: ''دبستانِ حدیث'' (ص: 623 تا 634)

مولانا شمس الحق سلفی تھا جنھوں نے 3۔ جولائی 1986ء کو وفات پائی۔ حضرت مرحوم کا شمار ہندوستان کے عالی مرتبت علما اور ممتاز اساتذۂ حدیث میں ہوتا تھا۔ بے شمار حضرات نے ان سے اخذِ علم کیا۔ ان کے صاحب زادے مولانا محمد عزیر شمس نے خالص علمی ماحول میں پرورش پائی اور وہ اپنے ملک ہندوستان کے مختلف تعلیمی اداروں کے اساتذہ سے استفادہ کرتے ہوئے مدینہ یونیورسٹی پہنچے اور وہاں متعدد ملکوں کے اصحابِ کمال سے چار سال اکتساب فیض کرتے رہے اور عربی زبان وادب میں درجہ تخصص سے بہرہ ور ہوئے۔ وہاں سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ کی جامعہ ام القریٰ میں داخلہ لیا۔ اس طرح دونوں یونیورسٹیوں میں تحصیل علم کی۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جو ان کے حصے میں آئی۔

ان کا دائرہ خدمتِ علم اللہ کے فضل سے بہت وسیع ہے۔ ان کا قلم عربی، اردو دونوں میدانوں میں یکساں چلتا ہے۔ طویل مدت سے مکہ مکرمہ میں اقامت گزیں ہیں اور خوب تصنیفی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

انھوں نے علامہ عبدالعزیز میمن کی تمام تصانیف وتحقیقات کا مطالعہ کیا اور علامہ نے عربی ادب ولغت کے سلسلے میں جو کارنامے سرانجام دیے، ان سے یہ بے حد متاثر ہوئے۔ اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے تمام مضامین ومقالات کو جو مختلف رسائل میں چھپے تھے، جمع کیا اور انھیں ”بحوث وتحقیقات للعلامة عبد العزيز الميمني“ کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔

محمد عزیر شمس صاحب ماشاء اللہ بڑے باہمت اور مستعد اہل علم ہیں۔ ہمیشہ کسی نہ کسی علمی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ انھوں نے جن کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- مسدس حالی کا نثری ترجمہ

- حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی "إتحاف النبيه"
- مولانا شمس الحق ڈیانوی کی "هداية النجدين" (مصافحہ ومعانقہ بعد العیدین کے موضوع پر)
- علامہ عبدالعزیز میمن کے بعض مقالات۔
- حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کی معیار الحق۔
- شاہ اسماعیل شہید دہلوی کی "إيضاح الحق الصريح"۔

عزیر شمس صاحب کو عربی مخطوطات سے خاص طور پر دلچسپی ہے اور وہ متعدد عربی مخطوطات ایڈٹ کر کے شائع کر چکے ہیں۔ سعودی عرب کے یہ جن اداروں سے وابستہ ہیں ان میں جامعہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) مجمع الملک فہد (مدینہ منورہ) اور اسلامی فقہ اکیڈمی (جدّہ) شامل ہیں۔[1]

اردو سے عربی میں تراجم کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ برصغیر کے بہت سے حضرات نے یہ خدمت سرانجام دی ہے، مگر میں نے تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا، صرف چار اہل علم کا تذکرہ کیا ہے، ان چاروں کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ پاکستان کے اہل حدیث علما کو بھی اس قسم کے کام کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

❁❁❁❁❁

[1] جناب محمد عزیر شمس کے حالات کے لیے دیکھیے راقم کی کتاب: "قافلہ حدیث" (ص: 634 تا 645) ان کے والد عالی قدر مولانا شمس الحق سلفی کے لیے ملاحظہ ہو: قافلہ حدیث (ص: 216 تا 226)

آٹھواں باب

قرآن وحدیث کے ہندی تراجم

ہندوستان کے صوبہ یوپی کے بے شمار مسلمان خاندانوں میں بے شمار علمائے کرام پیدا ہوئے، جنھوں نے بے پناہ علمی خدمات سرانجام دیں۔ ان خوش بخت خاندانوں میں ایک خاندان انھی مولانا خالد حنیف صدیقی فلاحی کا ہے، جن کی خدمات سے متعلق یہ سطور لکھی جارہی ہیں۔

مولانا ممدوح جولائی 1956ء کو موضع بیت نار تحصیل ڈومر یا ضلع سدھارتھ نگر (صوبہ یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا اسم گرامی مولانا محمد حنیف ہاتف سعیدی اور جدِ امجد کا نام نامی شیخ سعادت علی صدیقی تھا۔ شیخ سعادت علی صدیقی اپنے دور اور علاقے کے عربی اور فارسی کے مشہور عالم تھے، جو تمام زندگی تعلیم اور تدریس میں مصروف رہے۔ اپنے گاؤں بیت نار اور مضافات کے درجنوں گاؤں کی تین تین نسلوں کو انھوں نے زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔

مولانا خالد حنیف صدیقی کے والدِ مکرم مولانا محمد حنیف ہاتف اور دو چچا عبدالشکور دور صدیقی اور حافظ محمد حسین صدیقی معروف علمائے دین اور نامور خطیب تھے۔

خالد حنیف صدیقی نے قرآن مجید ناظرہ گھر میں پڑھا۔ اردو اور ہندی کی ابتدائی تعلیم بھی گھر میں حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے موضع طیب پور کے مدرسہ نصرۃ العلوم میں داخلہ لیا۔ یہاں منشی عابد علی سے ہندی، حساب، جغرافیہ، سائنس اور عربی وفارسی کا ابتدائی نصاب مکمل کیا۔ عربی کی جماعت ثالثہ تک کی تعلیم ایک اور مدرسے میں حاصل

کی۔ اس طرح انھوں نے مولانا محمد سعید، مولانا عبدالشکور دور صدیقی، ماسٹر عبدالکریم، ماسٹر عبدالمجید اور بعض دیگر اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ بعد ازاں جامعہ الفلاح بلریا (اعظم گڑھ) کا عزم کیا، وہاں کے اساتذہ سے عالمیت، فضیلت اور تخصص کا کورس مکمل کر کے 1976ء میں سند لی۔

جامعہ الفلاح میں انھوں نے مولانا جلیل احسن ندوی اصلاحی، مولانا شہباز احمد ہندی، مولانا نظام الدین اصلاحی، شیخ الادب مولانا عبدالحسیب اصلاحی، استاذ فقہ مولانا صغیر احسن اصلاحی، مولانا سلامت اللہ، مولانا رحمت اللہ اثری اور بعض دیگر حضرات سے استفادہ کیا۔ 1977ء میں جامعہ فیض عام مئو میں دورۂ حدیث کے لیے داخلہ لیا اور مولانا مفتی حبیب الرحمٰن فیضی سے سند واجازہ کا شرف حاصل کیا۔

1977ء میں فارغ التحصیل ہوئے اور اسی سال مدرسہ نور الہدیٰ اونر ہوا کی مسندِ تدریس پر متمکن ہوئے۔ اس مدرسے میں تین سال صدر المدرسین کی حیثیت سے خدمت سرانجام دی۔ اس اثنا میں وہاں کی خطابت وامامت کی ذمہ داری بھی انھی کے سپرد رہی۔

پھر مدرسہ نور الہدیٰ (اونر ہوا) سے مستعفی ہو کر موضع گڑرھیا کے مدرسہ دار الہدیٰ میں تدریسی خدمات سرانجام دینے لگے۔ وہاں بھی صدرالمدسین اور خطابت وامامت کے مناصب پر فائز تھے۔ اس نواح میں مدرسے کے اساتذہ اور طلبا کے ساتھ تبلیغی دوروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور ان دوروں کے نہایت اچھے نتائج نکلے۔ غیر مسلموں کو بھی اسلام کا پیغام پہنچایا۔

اس کے بعد دہلی چلے گئے۔ 1980ء اور 1981ء میں دو سال دہلی کے دارالکتاب والسنہ (صدر بازار) میں مدرس رہے۔ انھی دنوں جماعت اہل حدیث کے ایک بزرگ قاری عبدالمنان مرحوم کی کوشش سے موجودہ اہل حدیث کمپلیکس (دہلی)

میں دارالحدیث رحمانیہ کا اجراعمل میں آیا تو مولانا خالد حنیف صدیقی کو اس دارالحدیث کے صدر مدرس اور شیخ التفسیر والادب مقرر کیا گیا۔ درس وتدریس کے ساتھ ہندوستان کی مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے آرگن ''جریدہ ترجمان'' سے بھی وابستہ رہے۔ اب بھی جمعیت اور اس کے ''جریدہ ترجمان'' سے باقاعدہ منسلک ہیں اور تحریری خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ''تراجم علمائے حدیث'' کے نام سے ہندوستان کے اہل حدیث علمائے کرام کے حالات کی ترتیب کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ یہ بہت بڑی خدمت ہے جو انھوں نے اپنے ذمے لی ہے۔ اہل علم کے واقعاتِ حیات جمع کرنا اور خاص انداز سے انھیں ترتیب دینا نہایت اہم کام ہے، اور یہ اہم کام اللہ کی مہربانی سے مولانا خالد حنیف صدیقی خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں۔

مولانا خالد حنیف صدیقی فلاحی نے جو بہت بڑا کام کیا، وہ قرآن مجید اور کتبِ حدیث کا ہندی زبان میں ترجمہ ہے۔ اس برصغیر میں اسلام آیا تو اس سے کچھ عرصہ بعد یہاں کے اہل علم نے اسلامی لٹریچر فارسی زبان میں منتقل کیا۔ اردو نے ترقی کی تو پورا اسلامی لٹریچر اردو کے قالب میں ڈھال دیا گیا۔ انگریزی حکومت کے زمانے میں اس خطۂ ارض میں انگریزی زبان کا چلن ہوا تو تمام اسلامی احکام واوامر کا انگریزی میں ترجمہ کردیا گیا۔ اس کے علاوہ علاقائی زبانوں کو بھی اسلام کے تمام پہلوؤں سے آشنا کرنے کی مہم شروع کی گئی۔ مثلاً پنجابی، سندھی، پشتو، بنگلہ، بلوچی، گجراتی وغیرہ زبانیں اسلام کی بہت بڑی مبلغ بنیں اور ان کی وجہ سے اسلام نظم ونثر کی صورت میں گھر گھر پہنچا اور مرد وزن سب کی اس سے واقفیت ہوئی۔

آزادیِ برصغیر کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان ہندی قرار پائی تو مسلمان اصحابِ علم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اسلام کی نشر و اشاعت کے لیے انھیں ایک اور زبان مل گئی ہے، چنانچہ انھوں نے اس زبان کو باقاعدہ پڑھا اور اسلامی لٹریچر اس میں

منتقل کرنے کا عزم کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس خدمت میں انفرادی طور پر سب سے زیادہ مولانا خالد حنیف صدیقی کی مساعی کارفرما ہیں۔ ان کے اب تک کے تراجم کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے اور یہ ترجمے دہلی میں چھپ بھی گئے ہیں۔ ناشر ہے ہندوستان کی مرکزی جمعیت اہل حدیث۔

1- قرآن مجید: مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اردو ترجمے کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ ناشر مکتبہ ترجمان جامع مسجد دہلی۔ صفحات: 1414

2- قرآن مجید: ترجمہ مولانا فتح محمد خاں جالندھری۔ ہندی ترجمے کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ صفحات 1200

3- صحیح بخاری: ترجمہ وتشریح۔ چار جلد۔ صفحات 3500

4- صحیح مسلم: ترجمہ وتشریح۔ دو جلد۔ صفحات 1600

5- صحیح مسلم (مختصر المنذری) ترجمہ وتشریح۔ صفحات 1400

6- سننِ ابی داود: ترجمہ وتشریح تین جلد۔ صفحات 2500

7- بلوغ المرام: مولانا محمد صادق خلیل کے اردو ترجمے کا ہندی ترجمہ وتشریح۔ دو جلد۔ صفحات:1400

8- شیخ عبدالقادر جیلانی حیات وخدمات: صفحات:455

9- فتاویٰ المرأۃ (عورتوں کے مسائل) صفحات:650

10- فتاویٰ شیخ ابن باز: صفحات:600

11- بارہ سورہ شریف (قرآن مجید کی بارہ سورتیں، مرتبہ مولانا محمد داود راز مرحوم) صفحات: 400

12- حصن المسلم: صفحات:250

13- احکام الجنائز: (علامہ البانی) صفحات:401

14- اسلام میں حلال وحرام: (علامہ قرضادی) صفحات:350

15- صلاۃ الرسول: (حکیم محمد صادق سیالکوٹی) صفحات:450

16- صلاۃ النبی (از پروفیسر محمد اقبال کیلانی) صفحات:600

17- نماز نبوی (شفیق الرحمٰن) صفحات:500

18- شمع محمدی: صفحات:250

19- الحج والعمرہ: (شیخ ابن باز) صفحات:150

یہ انیس کتابیں ہیں جن کا مولانا خالد حنیف صدیقی نے ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ہزاروں صفحات میں پھیلا ہوا ہے۔ مولانا ممدوح صحاح کی تمام کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کرنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

ان میں چار کتابیں پاکستانی مصنفین کی ہیں۔ ایک حکیم محمد صادق سیالکوٹی کی صلاۃ الرسول، دوسری پروفیسر محمد اقبال کیلانی کی صلاۃ النبی۔ تیسری کتاب بلوغ المرام کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا محمد صادق خلیل مرحوم نے کیا اور مولانا خالد حنیف صدیقی نے اسے ہندی میں منتقل فرمایا۔ چوتھی کتاب ہے ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کی نماز نبوی۔! قرآن مجید کے ہندی ترجمے کے لیے بھی فاضل مترجم نے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم ومغفور کے اردو ترجمے کا انتخاب کیا، جنھوں نے 15۔ مارچ 1948ء کو سرگودھا میں رحلت فرمائی۔ اس طرح یہ اعزاز بھی پاکستان کے ایک عظیم المرتبت عالم کے حصے میں آیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد حکومتِ ہند نے کبھی صحیح نہیں بتائی۔ مردم شماری کے محکمے نے بھی مسلمانوں کی تعداد کے سلسلے میں ہمیشہ ڈنڈی ماری۔ وہاں کے جن مسلمانوں سے کبھی ملاقات کا موقع ملتا ہے، وہ پچیس کروڑ کے لگ بھگ اپنی تعداد بتاتے ہیں۔ بہر حال ان ہندی ترجموں سے ہندی جاننے والے مسلمان تو فائدہ اٹھا ہی

رہے ہیں، بے شمار غیر مسلم بھی ان تراجم کے ذریعے سے اسلامی تعلیم سے آشنا ہو رہے ہیں۔ برصغیر میں اسلام زیادہ تر تبلیغ سے پھیلا ہے۔ ان شاء اللہ یہ ہندی تراجم بھی لازماً اپنا اثر دکھائیں گے اور غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ ماشاء اللہ تنہا ایک شخص مولانا خالد حنیف صدیقی نے اتنا رفیع الشان کارنامہ انجام دیا۔ بے ساختہ ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس قسم کے عمل خیر کی مزید توفیق مرحمت فرمائے اور ان کے لیے اور ناشر کے لیے یہ خدمت صدقہ جاریہ ثابت ہو۔ اس قسم کی سرگرمیوں سے پتا چلتا ہے کہ ہندوستان کی جماعت اہل حدیث اجتماعی اعتبار سے بھی اور انفرادی اعتبار سے بھی اسلام کی بے حد خدمت کر رہی ہے۔ ان شاء اللہ ان کی یہ خدمت ضرور بہتر نتائج پیدا کرے گی۔ اس خدمت کو ہم اہل حدیث کی اولیات میں شمار کرتے ہیں۔ یقیناً اپنی ہمت کے مطابق ہندوستان کی دیگر جماعتوں کے اہل علم نے بھی اس قسم کی بنیادی خدمت سرانجام دی ہوگی اور دے رہے ہوں گے لیکن ہمیں اس کا علم نہیں۔

❀❀❀❀❀
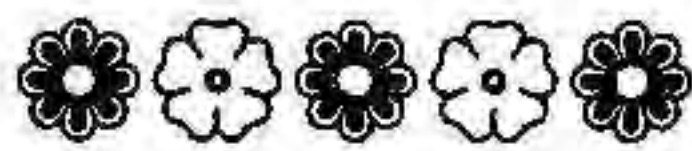
نواں باب

چھوٹی چھوٹی چند فقیرانہ اولیات

یہ فقیر بھی ان رفیع الشان حضرات کی پاکیزہ تریں مجلس میں شامل ہونے کا خواہش مند ہے، جن کا اولیات سے متعلق اس کتاب میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اگر ہم کم عمل بلکہ بے عمل ہونے کے باوجود انبیا وصلحا اور شہدا و اولیا کی مقدس تریں جماعت میں شمولیت کی اللہ سے دعا کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں تو مجھے بھی خوانندگانِ محترم اجازت دیں کہ میں بھی اپنی حقیر سی تصنیفی کاوشوں کا تذکرہ کروں اور ان جلیل القدر مصنفین کے زمرے کے قریب آنے کی سعی کروں۔ کہتے ہیں ایک بڑھیا سوت کے چند دھاگے لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں کی صف میں جا کھڑی ہوئی تھی اور کسی نے اس کو اس صف سے باہر نہیں نکالا تھا۔ میں بھی اپنے قلم سے نکلے ہوئے چند صفحات لے آؤں تو کیا مضائقہ ہے۔ اصحاب علم اگر انھیں پسند نہ کریں تو ان کی مرضی، مگر مجھے تو اپنی پسند کے اظہار کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

- الفہرست: یہ کتاب محمد بن اسحاق ابن ندیم وراق بغدادی کی تصنیف ہے جو 391 ہجری کے لگ بھگ فوت ہوئے۔ اس کتاب میں مصنف نے اپنی زندگی یعنی چوتھی صدی ہجری کے آخر تک کے تمام علوم وفنون اور مختلف مصنفین کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنے موضوع کی یہ نہایت اہم اور اولیں کتاب ہے۔ اسے ہزاروں سال قبل کے کتب ومصنفین، مذاہب و مسالک اور علوم وفنون کا دائرۃ المعارف کہنا چاہیے۔ میں نے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے اور وضاحت طلب مقامات پر حواشی لکھے ہیں۔ کتاب کا یہ اولیں ترجمہ ہے جو اشاریہ اور مقدمہ وفہرستِ مضامین

سمیت ساڑھے نوسو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے فارسی اور انگریزی ترجمے بعد میں چھپے۔

- برصغیر میں علم فقہ: اس کتاب میں ان گیارہ کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو صدیوں پیشتر ہندوستانی علما نے مسائلِ فقہ سے متعلق تصنیف کیں۔ ان میں دو مطبوعہ ہیں اور نو غیر مطبوعہ۔ ان میں سے بعض کتابیں عربی میں ہیں اور بعض فارسی میں، اور عبادات ومعاملات کے مسائل پر مشتمل۔ ہر کتاب کئی کئی سو صفحات پر محیط ہے۔ میں نے عبادات کا تذکرہ نہیں کیا، معاملات کو موضوعِ بحث ٹھہرایا ہے اور بتایا ہے کہ صدیوں پہلے کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں کس قسم کے مسائل مروّج تھے اور ان سے کس طرح عہدہ برا ہوا جاتا تھا۔ ہر کتاب کی عربی یا فارسی عبارتیں لکھ کر ساتھ ہی ان کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اپنے موضوع کی برصغیر میں پہلی کتاب ہے۔ بعض کتابوں میں سوالات وجوابات کا سلسلہ چلتا ہے جو بڑا دلچسپ ہے۔ پہلے یہ کتاب ادارہ ثقافت اسلامیہ نے لیتھو پر شائع کی تھی، اب خوب صورت انداز میں کتاب سرائے الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور کی طرف سے معرضِ اشاعت میں آئی ہے اور چار سو صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔
- فقہائے ہند: یہ کتاب دس جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں پہلی صدی ہجری سے لے کر تیرھویں صدی ہجری تک کے تقریباً ڈھائی ہزار علما وفقہا کے حالات قیدِ تحریر میں آگئے ہیں اور ان میں سے جس بزرگ نے جو تدریسی اور تصنیفی کارنامے انجام دیے، ان کی دست یاب تفصیل بیان کردی گئی ہے۔ ہر جلد پر مقدمہ لکھا ہے، جس میں اس صدی کے ہندوستانی بادشاہوں اور حکمرانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے دور کے علما وفقہا سے کس قسم کے

تعلقات رکھتے تھے اور علما کا ان کے ساتھ کیا وتیرہ تھا۔ اپنے موضوع کی اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ بہت سال گزرے اسے ادارہ ثقافت اسلامیہ نے لیتھو پر شائع کیا تھا اور ہر سال ایک جلد شائع ہوتی تھی۔ اس طرح یہ دس جلدیں دس سال میں چھپیں۔ اب اسے بہترین کمپوزنگ اور عمدہ کاغذ پر کتاب سرائے (الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور) کی طرف سے شائع کیا جارہا ہے۔

- **برصغیر میں اسلام کے اولیں نقوش:** سوا دو سو صفحات کی اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ باشندگانِ برصغیر پہلی صدی ہجری کے ابتدائی دور ہی میں اسلام اور اس کی دل آویز تہذیب سے آشنا ہوگئے تھے۔ موجودہ جغرافیائی اعتبار سے تھانہ کی بندرگاہ کے راستے جو بمبئی کے قریب ہے، یہاں اسلام کی روشنی پھیلنی شروع ہوگئی تھی۔ مختلف اوقات میں یہاں رسول اللہ ﷺ کے پچیس صحابہ کرام، بیالیس تابعین عالی مقام اور اٹھارہ تبع تابعین تشریف لائے۔
- **برصغیر میں اہل حدیث کی آمد:** اپنے مندرجات کے اعتبار سے یہ منفرد نوعیت کی کتاب ہے جو ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔
- **برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن:** سات سو صفحات کی اس کتاب میں برصغیر کے ان 185 اہل حدیث حضرات کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے، جنھوں نے عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ہندی، سندھی، بنگلہ، بلوچی، پشتو، پنجابی، سرائیکی، ملتانی؛ کسی بھی زبان میں (بہ صورت نظم یا نثر) قرآن کا ترجمہ کیا یا اس کی تفسیر لکھی یا اس کے حواشی تحریر کیے، مفصل یا مختصر۔ ہر مترجم، ہر مفسر اور ہر محشی کے حالات ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ یہ خدمت بھی اس فقیر کی اولیات میں شامل ہے۔ اس سے قبل اس قسم کی خدمت کی مثال نہیں ملتی۔
- **تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری:** قاضی صاحب ممدوح برصغیر کے عظیم

مصنف اور سیرت نگار تھے۔ اردو میں نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر ان کی تصنیف ''رحمۃ للعالمین'' تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو بے حد شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی۔ عربی اور انگریزی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ دنیوی وقار میں بھی قاضی صاحب کا مقام بڑا بلند تھا۔ وہ متحدہ پنجاب کی سب سے بڑی سکھ ریاست پٹیالہ کے سیشن جج تھے۔ جماعت اہل حدیث میں ان کا درجہ اتنا اونچا تھا کہ انھیں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے بعض جلسوں میں عہدۂ صدارت پر متمکن کیا گیا اور انھوں نے تحریری خطباتِ صدارت ارشاد فرمائے۔ لیکن ان کی وفات سے 77 سال بعد ان کے حالات اس فقیر نے لکھے جو ''تذکرہ قاضی محمد سلیمان منصور پوری'' کے نام سے پانچ سو صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کتاب میں ریاست پٹیالہ کی تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔

- تذکرہ صوفی عبداللہ: دارالعلوم تعلیم الاسلام اوڈاں والا اور جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن (ضلع فیصل آباد) کے بانی صوفی عبداللہ مرحوم ومغفور کا تذکرہ اس فقیر نے لکھا جو ساڑھے چار سو صفحات پر محیط ہے۔

اسی طرح قافلہ حدیث، کاروان سلف، دبستان حدیث، گلستان حدیث، نقوش عظمت رفتہ، بزمِ ارجمنداں، مولانا محمد حنیف ندوی کے حالات میں ارمغانِ حنیف، تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی، تذکرہ مولانا احمد الدین گکھڑوی، روپڑی علماے حدیث، برصغیر میں اہل حدیث کی تدریسی اور تنظیمی سرگزشت، مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کی کانفرنسوں میں پڑھے گئے استقبالیہ اور صدارتی خطبات۔ تذکرہ مولانا محی الدین لکھوی۔ برصغیر میں اہل حدیث کی اولیات جو خوانندگان محترم کے زیر مطالعہ ہے۔ اب چمنستانِ حدیث لکھ رہا ہوں۔ ان شاء اللہ یہ بھی تھوڑے عرصے میں مکمل ہو جائے گی۔

میں اپنے متعلق لکھنا تو کچھ اور بھی چاہتا تھا لیکن قلم آگے بڑھنے سے انکار کر رہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اپنے بارے میں زیادہ باتیں کی جائیں۔ قلم سے میرا چونسٹھ سال سے یارانہ ہے اور اس طویل عرصے میں اس نے میری ہر بات مانی ہے، جدھر کو میں نے اسے چلانا چاہا یہ فوراً چل پڑا۔ اب یہ مجھے آگے بڑھنے سے روکنا چاہتا ہے تو اخلاقی طور پر میرا فرض ہے کہ رک جاؤں۔ مجھے اس کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ خفا ہو جائے۔ چنانچہ میں اس کا حکم مانتے ہوئے انہی چھوٹی چھوٹی چند فقیرانہ اوّلیات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔

❀❀❀❀❀
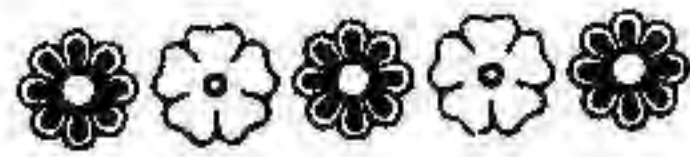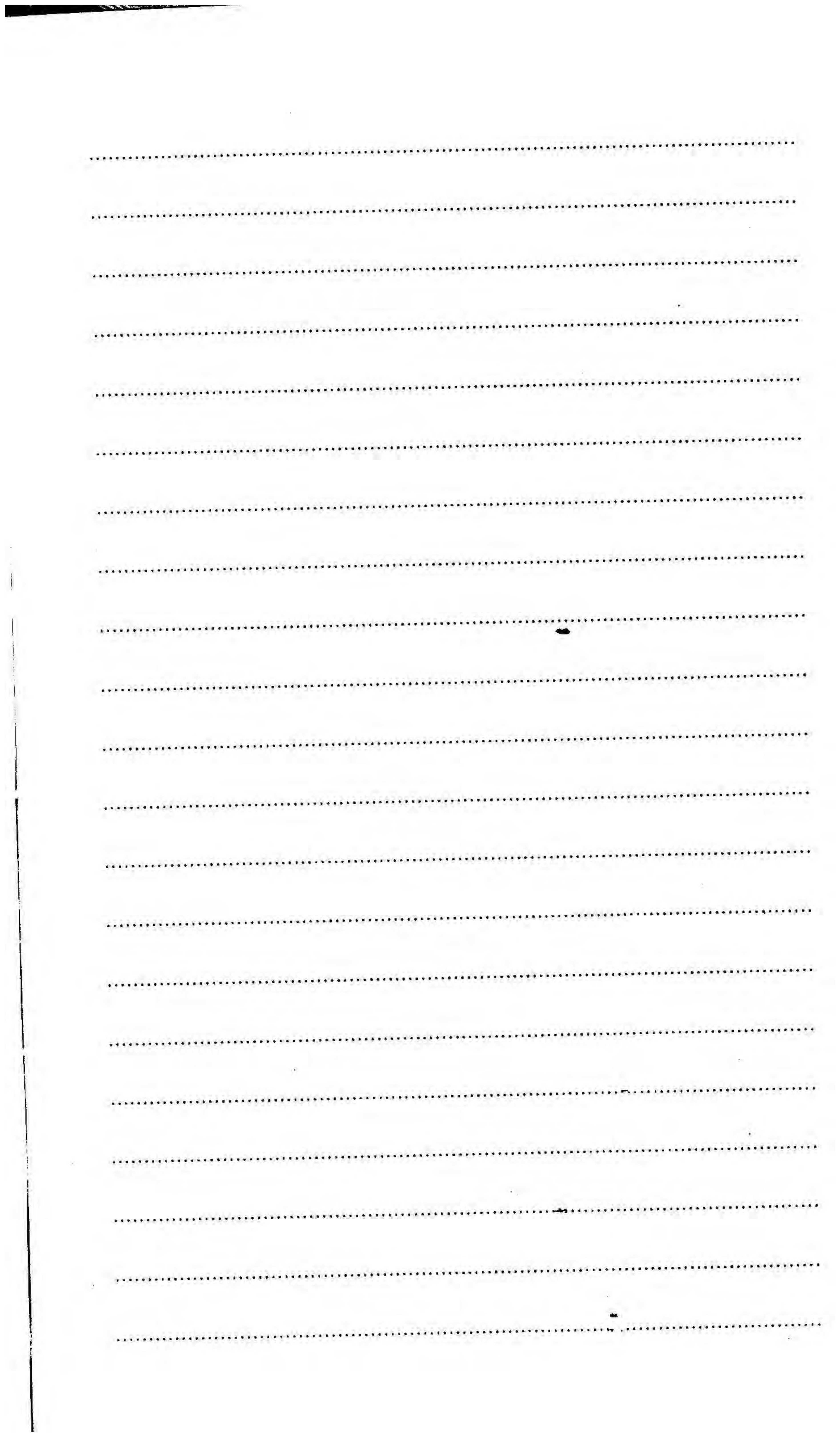
اوّلیت اور پیش قدمی کی سعادت اپنے ماحول میں ان قدآور اور کوہ وقار شخصیتوں کے حصے میں آتی ہے جو عزم واستقلال، علم وفضل، نظم وضبط اور اپنے مشن سے والہانہ وابستگی کے سبب دوسروں سے ممتاز ہوتی ہیں۔ کارِخیر میں اوّلیت کے چشمے دل کی گہرائیوں میں پھوٹتے ہیں جو اپنے ماحول کی سیرابی کا باعث ہوتے ہیں۔ تکلف وتصنع کا اس عمل میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

مولانا محمد اسحاق بھٹی صاحب کی تازہ تریں کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی اوّلیات'' صفحات کی تعداد کے اعتبار سے اگرچہ اختصار کا پہلو لیے ہوئے ہے، لیکن اس اختصار میں اپنے موضوع کی تمام اہم اور ضروری چیزیں ضبطِ تحریر میں آگئی ہیں۔ مجھے اس مختصر کتاب کا مطالعہ کر کے بے حد مسرت ہوئی۔ اس میں اہل حدیث کی نو اوّلیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس میں اختصار اور جامعیت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اہل حدیث کی خدمتِ قرآن، خدمتِ حدیث، سیاسی تگ وتاز، قادیانیت کے خلاف محاذ آرائی وغیرہ کا تذکرہ لائق مطالعہ ہے۔

محترم بھٹی صاحب کو ابتدائی زندگی ہی میں مطالعہ کتب کا شوق تھا۔ برصغیر کی اسلامی تاریخ سے انھیں بالخصوص دلچسپی تھی۔ اس میں بھی اہل حدیث کی تگ وتازِ بوقلموں ان کا انتہائی پسندیدہ موضوع تھا۔ اہل حدیث کی تصنیفی مساعی، ان کی تدریسی تگ ودو، ان کی سیاسی جدوجہد اور ان کی مناظرانہ سرگرمیوں سے آگاہ ہونے کی کوشش ہمیشہ بھٹی صاحب کا اصل مقصد رہی۔ ان کے قلم سے شخصیات کے تراجم کی شکل میں جماعت کی تاریخ مرتب ہو رہی ہے اور ان کی تحریروں سے بہت سی ان گراں قدر شخصیات کو حیاتِ جاودانی ملی جو گوشۂ نسیان میں جاچکی تھیں۔ بھٹی صاحب نے زمانے کی ناہمواریوں اور نرم وگرم حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے جس یک سوئی کے ساتھ تاریخ وتراجم کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور دے رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی نصرت وتائید کے بغیر ممکن نہ تھا۔

﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ کے طور پر اس محسن ادارہ لجنۃ القارۃ الہندیہ (جمعیت احیاء التراث الاسلامی، کویت) اور اس کے صدرِ گرامی، قدردانِ علم وعلما شیخ ابوخالد فلاح خالد المطیری کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، جن کی توجہ خاص سے تصنیف وتالیف جیسے کارِخیر کی کفالت ہو رہی ہے۔

اس موقع پر برادرِ گرامی شیخ عارف جاوید محمدی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے، جن کی نگرانی میں تصنیف وتالیف کا عمل پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے ان تمام محسنین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کو دنیا وآخرت کی کامیابیوں سے نوازے۔ آمین یارب العالمین۔

فضیلۃ الشیخ صلاح الدین مقبول احمد